Regd. L. No.7243 Phone 880800

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل 1982

اس پرچہ میں :-

پاکستان کا تصور کس نے دیا تھا؟

(خان عبدالولی خان کے الزام کی حقیقت)

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون	بدلِ اشتراک
۳ تین روپیہ	۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	سالانہ پاکستان -/۳۶ روپیہ غیر ممالک -/۸۶ "
شمارہ ۴	اپریل ۱۹۸۲ء	جلد ۳۵

فہرست

۱۔ لمعات ——— (ربا اور اقبالؒ) ——— 2

۲۔ قصرِ پاکستان کی بنیاد کی اینٹیں ——— (بتقریب یوم پاکستان) ——— 5

۳۔ مطالب الفرقان، جلد چہارم ——— 16

۴۔ "ضرب کلیم" ۔ ۲۱ اپریل کی یاد میں ——— (ڈاکٹر عبدالوہاب عزام (مرحوم) و پرویز صاحب) ——— 17

۵۔ فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ——— 31

۶۔ قرآنی درس کے اعلانات ——— 32

۷۔ پاکستان کا تصور کس نے دیا تھا؟ ——— 33

(یوم پاکستان ۱۹۸۲ء کی تقریب پر محترم پرویز صاحب کا خصوصی خطاب) ———

۸۔ تصوف کی حقیقت! ——— 61

۹۔ طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک! ——— 62

۱۰۔ ایشیا چکار رسالت ؐ ——— عمر فاروق ؓ ——— (تیسرا ایڈیشن) ——— 64

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر شیخ عبدالحمید۔ مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۹ رایبک روڈ۔ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

بیادِ اقبالؒ

لمعات

سفر اور آوارگی، دونوں میں انسان کے قدم اٹھتے ہیں۔ وہ راستہ طے کرتا ہے، اس کا وقت اور توانائی صرف ہوتی ہے۔ اس کے کام کاج کا ہرج ہوتا ہے۔ لیکن سفر کی ہر شخص تعریف کرتا اور اسے ضروری قرار دیتا ہے لیکن آوارگی انتہائی معیوب سمجھی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ سفر اور آوارگی میں فرق کیا ہے؟ ان میں فرق صرف اس قدر ہے کہ سفر میں چلنے والے کے سامنے ایک متعیّن منزل ہوتی ہے اور اس کا ہر قدم اس منزل کی طرف اٹھتا ہے۔ اس کے برعکس، آوارگی میں چلنے والے کے سامنے کوئی منزل متعیّن نہیں ہوتی۔ اس کا قدم کسی خاص سمت کی طرف نہیں اٹھتا۔ وہ یونہی کبھی اِدھر کو ہو لیتا ہے کبھی اُدھر کو۔ اس طرح وہ دن بھر چلتا رہتا ہے۔ اپنے کام کاج کا ہرج کرتا ہے۔ وقت اور قوت صرف کرتا ہے لیکن اسے حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ لہٰذا آوارگی کے معنی ہیں سفر بلا تعیینِ منزل۔

یوں تو جس زمانہ سے ان کی مرکزیت فنا ہوئی، تمام دنیا کے مسلمان فکر و نظر کی آوارگی میں مبتلا چلے آ رہے تھے، لیکن بیسویں صدی کے ربعِ اوّل میں، ہندوستان میں یہ بگولے کا رقص اپنی انتہائی شدّت تک پہنچ گیا تھا۔ دیکھنے والے دیکھتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کس طرح برق در آغوش کسی موہوم مقصد کے حصول کے لئے ہمہ تن اضطراب بن رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے سینے میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں جو انہیں کسی وقت بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ کچھ کانٹے ہیں جو ان کے تلووں میں بُری طرح چُبھ گئے ہیں اور وہ ان کے پاؤں کو کسی ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتے۔ ایک حرکتِ پیہم اور سعیِ مسلسل ہے جس نے اس قوم کو سیماب پا بنا رکھا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ قوم مصروفِ جدّ و جہد تھی لیکن کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ اس جدّ و جہد کا مقصود کیا ہے۔ ان کے قدم اٹھتے تھے لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ جا کدھر کو رہے ہیں؟ غیر تو ایک طرف، خود چلنے والوں کو اس کا پتہ نہیں تھا کہ ہم کیوں چل رہے ہیں اور ہم نے جانا کہاں ہے؟ قوم تنہا نہیں چل رہی تھی، راہنماؤں کے ساتھ جا رہی تھی۔ ان راہنماؤں کے سا تھ جن کے خلوص میں شبہ نہیں تھا۔ لیکن خود ان راہنماؤں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ہم نے کدھر جانا ہے اور قوم کو کہاں لے جانا ہے۔

قوم اس سفرِ بے منزل میں مصروفِ جادہ پیمائی تھی، لیکن ایک سادہ سا انسان تھا جو ان سب سے الگ ہٹ کر، ایک گوشے میں بیٹھا، ایک کتاب کو سامنے رکھے پوری خاموشی سے کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آتا تھا۔ قوم کے تیز خرام رہرو اسے آوازوں پر آوازیں دیتے، وہ ان کی طرف غم آلود آنکھوں سے دیکھتا اور پھر اسی کتاب کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا۔ شعلہ بکیر راہنمایانِ قوم بے عمل کا طعنہ دے کر اسے اس کی فکرگاہ سے باہر کھینچنے کی کوشش کرتے لیکن ان کے یہ کچوکے بھی ناکام رہتے۔ بڑی سے بڑی جاذبیت اور سخت سے سخت ہنگامہ بھی اس کی نگاہوں کو ایک ثانیہ کے لئے بھی اس

کتابِ عظیم کے صفحات سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکتے۔ وہ اسی طرح دریا کے تلاطم خیز اضطراب میں، سکوتِ سکونِ گہر کے ساتھ، اپنی خلوت گاہ میں محوِ تفکر رہا، تا آنکہ ۱۹۳۰ء کی ایک شام وہ وہاں سے باہر نکلا اور ان راہ نوردانِ شوق کو الٰہ آباد کے مقام پر اکٹھا کر کے انہیں بتایا کہ تمہارا یہ سفر، سفر نہیں آوارگی ہے۔ اور یہ آوارگی ہی رہے گا جب تک تم اپنی منزل کا تعین نہ کر لو۔ تمہاری منزل یہ ہے کہ تم ایک خطۂ زمین حاصل کرو جس میں تم اس کتابِ عظیم کے بتائے ہوئے نقشے کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکو۔ اس نے کہا کہ اگر یہ مقصد تمہارے سامنے نہیں تو تمہاری تمام جدّوجہد بے سود اور تمام سعی و کاوش لاحاصل ہے۔ بے سود اور لاحاصل ہی نہیں، بلکہ سخت نقصان دہ اور ہلاکت انگیز ہے۔

پاکستان اس خطۂ زمین کا نام ہے، جو اس مردِ درویش کے دیئے ہوئے تصوّر کے مطابق اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے حاصل کیا گیا ہے۔ یہ قوم کی انتہائی خوش بختی تھی کہ ..... عین اس وقت جب وہ اپنی بے پناہ "آوارگی" سے ہار تھک کر بیٹھ جانے کے قریب پہنچ چکی تھی، اسے اقبالؒ جیسا دانائے راہ مل گیا جس نے اپنی بصیرتِ قرآنی سے ان کے لئے ایسی درخشندہ و تابناک منزل کا تعین کر دیا۔ لیکن اس کے بعد اس قوم کی انتہائی بدقسمتی تھی کہ جب اسے وہ خطۂ زمین حاصل ہوا تو اقبالؒ ان سے جا چکا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ قوم پھر اسی آوارگیٔ فکر و نظر کا شکار ہو گئی۔ پاکستان کی ساری تاریخ، اسی فکری تشتت اور ذہنی انتشار کی عبرت انگیز اور ذلت آمیز داستان ہے۔ حالانکہ اقبالؒ کے متعین کردہ نشاناتِ راہ بھی ان کے سامنے ہیں اور منزلِ مقصود بھی۔ منزلِ مقصود تو اس نے کہا کہ اس کے سوا کوئی نہیں کہ اس خطۂ زمین میں خالص قرآنی مملکت قائم ہو جائے۔ لیکن یہ مملکت (بقول ان کے) وہی قائم کر سکے گا جو (حضرت) عمرؓ جیسی جرأت کے ساتھ یہ اعلان کرے کہ ـــــ حسبنا کتاب اللہ ـــــ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے راستے سے خاردار جھاڑیوں کو صاف کر دیا جائے۔ یہ جھاڑیاں ہیں مذہبی پیشوائیت کی جکڑ بندیاں۔ چنانچہ انہوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقدہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کے خطبۂ صدارت میں واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ

> تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند فطری، ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

اور سب سے بڑی رکاوٹ، مسلمانوں کا افلاس اور غربت۔ اس کے متعلق انہوں نے اپنی اس تقریر کے دوران، جو انہوں نے ۱۹۱۰ء میں علی گڑھ میں کی تھی، اور جس کے اردو ترجمہ کا عنوان تھا ـــــ

"ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کیا تھا:۔

یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہوگا کہ غریب مسلمان کی اقتصادی حالت نہایت ہی افسوسناک اور قابلِ رحم ہے۔ شہروں میں جہاں کی آبادی کا جزوِ غالب مسلمان ہیں، معمولی درجہ کے مسلمانوں کی قلیل اُجرت، غلیظ مکان، اور ان کے پیٹ بھر روٹی کے ترستے ہوئے بچوں کا حسرت ناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا؟ لاہور کے کسی اسلامی محلہ میں جا نکلو ایک تنگ و تاریک کوچہ پر تمہاری نظر پڑے گی جس کے وحشت زا سکوت کے طلسم کو توڑ کر یا تو لاغر و نیم برہنہ بچوں کی چیخ و پکار یا کسی پردہ نشین بڑھیا کی لجاجت آمیز صدا توڑتی ہوگی جس کی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیاں برقعہ میں سے نکل کر خیرات کے لیے پھیلی ہوئی ہوں گی۔ یہ تو گلی کی حالت تھی۔ الم زدہ گھروں کے اندر جا کر دیکھو تو صدہا مرد اور عورتیں ایسی پاؤ گے جنہوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے، لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں۔ کئی دن سے اناج کا ایک دانہ تک منہ میں اُڑ کر نہیں گیا۔ لیکن غیرت اور خودداری اجازت نہیں دیتی کہ خیرات کے لیے کسی کے آگے ہاتھ پسارین۔ ہمارے نوجوان علمبردارانِ اصلاح تمدن جو پردہ کی رسم کو ہماری قوم کے قومی کے روز افزوں انحطاط کا باعث قرار دینے کے عادی ہیں شاید یہ نہیں جانتے کہ اس انحطاط کا اصلی ذمہ دار پردہ نہیں بلکہ یہ جان فرسا افلاس ہے جو ہماری قوم کے ادانی و اقاصی کو کھائے جا رہا ہے۔

اور پھر وہ ساری عمر قوم کو مذہبی پیشوائیت سے نجات دلانے، اور بھوک سے کراہنے والوں کی دل خراش صداؤں کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے جہاد میں مصروف رہے۔ ان مقاصد کے لئے انہوں نے پاکستان کی تجویز پیش کی تھی۔

طلوعِ اسلام کا اگلا پرچہ

یکم مئی کے بجائے یکم جون ۱۹۸۲ء کو شائع ہوگا

طلوعِ اسلام کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ اپنے اشاعتی پروگرام پر بڑی شدت سے پابند چلا آ رہا ہے۔ بایں ہمہ بعض اوقات ایسے ناگزیر حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے اس پابندی میں مجبوراً استثناء کرنی پڑ جاتی ہے۔ ایسے ہی حالات کے تحت ہم بادلِ نخواستہ یہ اعلان کرنے پر مجبور ہیں کہ اس کا اگلا پرچہ، یکم مئی کے بجائے یکم جون ۱۹۸۲ء کو شائع ہوگا۔ قارئین کو اس سے جو تکلیف محسوس ہوگی اس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ اس اشاعت میں محترم پرویز صاحب کا ایک بڑا اہم مقالہ شائع ہوگا۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

تقریب یوم پاکستان

قصرِ پاکستان کی بُنیاد کی اینٹیں

لاہور کے اقبال پارک میں (جو اس سے پہلے منٹو پارک کہلاتا تھا) وہ "مینارِ پاکستان" ایستادہ ہے جو مسلمانانِ ہند کے اُس عزمِ بلند کی منہ بولتی شہادت ہے جس کے نتیجے میں انہوں نے پاکستان کی عظیم مملکت حاصل کی تھی۔ لوگ دور دراز سے آتے ہیں اور اس مینار کی سربلندی و سرفرازی سے اس ملت کی سروقامتی کی یاد تازہ کرتے ہیں جس نے اس قدر کوہ شکن اور رخارہ شگاف عزم کا نعرہ بلند کیا تھا۔ وہ اس یادگار کی رفعتِ شان، اس کی محرابوں کے حسنِ تناسب۔ اس کے ڈیزائن کی انفرادیت۔ اس پر کندہ آیات اور پیغامِ اقبال کی نادرہ کاری کو دیکھتے اور اس مجسمۂ جلال و جمال کے حسن و رعنائی کی داد دیتے ہیں۔ یہ حضرات وہ سب کچھ دیکھتے ہیں جو سطحِ زمین کے اوپر ایستادہ ہے لیکن وہ اینٹیں جو اس کی بنیاد میں گڑی ہیں، وہ کسی کو نظر نہیں آتیں۔ یہ وہ اینٹیں ہیں جو اس قدر سر بفلک عمارت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھائے کھڑی ہیں لیکن جن کی طرف اس عمارت کے زائرین کا خیال تک بھی نہیں جاتا۔ بنیاد کی اینٹوں کا مقدر یہی ہوتا ہے کہ وہ اس قدر کمر شکن بوجھ کو اپنے سر پر اٹھائے رکھیں لیکن ان کے دل میں بھی خواہشِ نمود تک بیدار نہ ہو۔ وہ ہر ایک کی نگاہوں سے پوشیدہ رہیں۔ اس حد تک پوشیدہ کہ ان کی ہستی اور موجودگی تک کا کسی کو احساس نہ ہو۔ کتنا بڑا ایثار ہے ان نادیدہ بوجھ اٹھانے والوں کا ——— وہ ایثار جس کے بغیر اس عمارت کا ایک روڑہ تک بھی اٹھایا نہ جا سکتا۔

جو حالت مینارِ پاکستان کی ہے وہی کیفیت خود مملکتِ پاکستان کے قصرِ بلند و بالا کی ہے۔ اس کی بالائے سطحِ زمین کی عمارت ساری دنیا کی نگاہوں میں ہے لیکن اس کی بنیاد کی جن اینٹوں کے تصدق یہ وجود میں آئی تھی ان کی یاد تک ذہنوں سے مٹتی جا رہی ہے۔ لیکن طلوعِ اسلام نے تو ان اینٹوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لئے یہ انہیں کس طرح فراموش کر سکتا ہے؟ یوں تو یہ اینٹیں ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے رہتی ہیں لیکن ۲۳ مارچ کو ان کی یاد کچھ زیادہ ہی شدت کے ساتھ اس کے قلبِ محزوں میں وجۂ "تلاطم" بنتی ہے۔ آج ہم ان اینٹوں میں سے ایک ایسی اینٹ کا تذکرہ باعثِ تزئینِ اوراق کرتے ہیں جسے اس بنیاد کا کونے کا پتھر کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا۔ اس سنگِ بنیاد کا تعارف، "حق شناس" کے قلم سے، طلوعِ اسلام کی مارچ ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا (اور ۱۹۷۵ء میں یہ پرویز صاحب کے اضافہ کے ساتھ دوبارہ سامنے لایا گیا تھا)۔ ہم ۱۹۸۲ء کے یوم پاکستان کی تقریب اسی کے تذکرہ کے ساتھ منسلک کرنے کا فخر حاصل کرتے ہیں۔

غالباً ۴۴ - ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے، میں سرحد کے مضافات میں اپنے بچپن کے خوابوں کی تعبیر تلاش کر رہا تھا۔ وہ مضافات جو عمر بھر

میرے تصوّرات کی آماجگاہ اور مستقبل سے متعلق میری امیدوں کا محور بنے رہے تھے۔ میں جوں جوں وہاں بسنے والے آہنی انسانوں کی فطرت و نفسیات کا مطالعہ کرتا، مجھ پر عجیب و غریب راز منکشف ہوتے چلے جاتے۔ سب سے زیادہ تحیّر انگیز ان کے سیاسی شعور کی بیداری تھی۔ ان دور دراز مقامات میں جہاں شاید ہی کبھی کوئی اخبار پہنچتا ہو، ہل چلانے والے کسان اور گدھے ہانکنے والے دہقان مقامی، ملکی، بین الاقوامی اور اسلامی سیاست سے متعلق اس قسم کے سوالات پوچھتے کہ ہمارے شہروں کے اچھے اچھے دانشوروں کے ذہن میں بھی نہ آسکیں۔ پھر، وہ بات کو سمجھتے اس تیزی کے ساتھ کہ فقرۂ آغاز سے فوراً مآلِ کار تک پہنچ جاتے۔ لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ حیرت افزا ایک اور "آواز" تھی جو ہر مقام اور ہر گوشے سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے جس سے بات کی اس نے کہا کہ "ہاں۔ صدر صاحب نے بھی یہی کہا تھا" "صدر صاحب کا بھی یہی فیصلہ ہے" "ہم صدر صاحب سے پوچھ کر بتائیں گے" میں حیران تھا کہ یا اللہ یہ "صدر صاحب" کون بزرگ ہیں جن کے ذکر سے ساری فضا معمور ہے۔ میں یونہی پھرتا پھراتا ایک دن اپنے میزبان کے ہمراہ ایک جرگہ میں جا پہنچا جہاں ایک اہم مسئلہ زیرِ بحث تھا۔ مخالف و موافق سمت سے شعلہ فگن تقریریں ہو رہی تھیں، ہر پٹھان کے پاس اس کی رائفل یا طپنچہ اور کارتوسوں کی پیٹی کمر سے بندھی ہوئی۔ محفل میں اس قدر شدید حرارت پیدا ہوگئی کہ مجھے اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اب یہ پٹھان "متشابہات" سے "محکمات" پر اتر آئیں گے اور فریقین میں گولی چل جائے گی۔ میں نے ایک پاس بیٹھے ہوئے بڈھے پٹھان سے پوچھا کہ اب کیا ہوگا؟ اس نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ "وہی ہوگا جو صدر صاحب کہیں گے"۔ اب میری تمام حیرت سمٹ کر نگاہوں میں آگئی کہ بالآخر ان "صدر صاحب" کو دیکھ سکوں گا جن کے تذکروں سے ساری فضا معمور تھی۔ آخری مقرر کی تقریر کا دھواں ابھی فضا میں گم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ ایک گوشے میں سرسراہٹ سی پیدا ہوئی۔ ساری محفل پر سناٹا چھا گیا۔ ہمہ تن آتش پٹھان، برفانی مجسمے بن گئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک چھ فٹ سے بھی زیادہ قد آور، تنومند، قوی ہیکل، پیکر جھٹکا دے کر اٹھا اور نہایت متانت سے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ مجمع میں سے ہر شخص کی نگاہیں اس کی طرف مرکوز تھیں۔ سر پر دہقانی ٹوپی کے اوپر ایک چھوٹا سا پٹکا یونہی بے ترتیبی سے لپٹا ہوا۔ چوڑا چکلا چہرہ، سرسید جیسی ڈاڑھی۔ عقاب کی سی چمکیلی، روشن آنکھیں۔ لبوں پر معصومانہ مسکراہٹ۔ پنڈلیوں تک ایک لانبا کرتا اور اسی کپڑے کا دو دو گز کا "راشول"[1] والا شلوار[2]۔ ایک "چادر" یونہی ادھر ادھر شانوں سے لٹکتا ہوا۔ کرتے پر ایک صدری، جس کا ایک جیب توشہ دان اور دوسرا لیٹر بکس دکھائی دیتا تھا۔ یہ تھے "صدر صاحب" جن سے میں اتنے دنوں سے ہر گاؤں اور ہر قریہ میں غائبانہ طور پر متعارف ہوتا چلا آرہا تھا۔ انہوں نے مجمع پر ایک خاموش لیکن نہایت پُرمعنی نگاہ ڈالی۔ اور اس کے بعد نکھری اور سلجھی ہوئی پشتو میں تقریر شروع کی۔ میں محوِ حیرت تھا کہ سرحد کے کسی ویرانے میں بیٹھا ہوں یا لندن کے پارلیمنٹ ہاؤس میں۔ ایک دہقانی پٹھان کو سن رہا ہوں یا چرچل اور ہٹلر کو (اس زمانہ میں ہٹلر کی تقریروں کی بڑی دھوم ہوا کرتی تھی) تقریر میں بین الاقوامی سیاست کا تجزیہ، ہندوؤں کی نگاہ فریب دسیسہ کاریوں کی نقاب کشائی، تحریکِ قومیت پرستی کی ابلہ فریبیوں کا کچا چٹھا، مسلم لیگ کے خلاف اعتراضات کے جوابات، سیاستِ حاضرہ میں اسلامی نقطۂ نگاہ کی ترجمانی، سب کچھ آگیا اور اس مؤثر انداز سے کہ سامعین میں سے کوئی اونچی سانس تک نہیں لیتا تھا۔ تقریر میں کہیں بجلی سی کڑک اور بادلوں کی سی گرج تھی اور کہیں ندی کی

---

[1] سرحد کے اس پار، پٹھانوں کو "راشے" کہتے ہیں۔

[2] میں نے قصداً شلوار کو مذکر لکھا ہے اس لئے کہ پٹھان کی شلوار اتنی بڑی ہوتی ہے کہ اسے مؤنث لکھنا اس کی تحقیر ہے۔

بے صوت نغمہ خوانیاں اور پُر سکوت روانیاں۔ اس تقریر کے بعد اس متقی آتش نفس نے مجمع سے پوچھا کہ کہو! آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ فیصلہ کیا تھا؟ وہی جو مجھ سے اس بڈھے پٹھان نے کہا تھا۔ کسی ایک اختلافی آواز کے بغیر متفقہ طور پر سب نے اس پر صاد کیا جو "صدر صاحب" نے کہا تھا۔

رات کو میں نے کھانے کے بعد اپنے میزبان کو اٹھنے نہ دیا اور ان سے کہا کہ خدا کے لئے مجھے بتائیے کہ یہ "صدر صاحب" کون ہیں۔ انہوں نے خشک پشاوری تمباکو کا ایک لمبا سا کش لگایا اور حقہ کو اٹھوا کر میرے پاس بیٹھ گئے اور کہا۔

"غالباً ۱۹۲۰ء کا ذکر ہے۔ تحصیل صوابی (ضلع مردان) کے ایک گاؤں، نواکلی، میں ایک کاشتکار نوجوان لڑکا ایک دن اپنے گھر کے صحن میں چارپائی پر لیٹ گیا اور اپنی والدہ، ہمشیرگان، بیوی، سب کو بلا بھیجا۔ وہ حیرت سے چارپائی کے گرد کھڑی ہو گئیں تو اس نوجوان نے ان سے کہا کہ "تم جی بھر کر رو لو کہ میں تمہارے لئے آج سے مر چکا"۔ یہ تحریک خلافت کا زمانہ تھا۔ یہ نوجوان باہر نکلا اور اگرچہ تحریک میں محض رضاکار کی حیثیت سے شامل ہوا لیکن اپنے حسنِ سیرت و کردار اور مخلصانہ تقریروں اور گرمجوشیوں سے علاقہ بھر میں آگ لگا دی۔ عوام میں سیاسی شعور کو بیدار کیا۔ حاجی صاحب ترنگزئی کے بند پڑے ہوئے مدرسے پھر سے کھلوائے۔ گاؤں گاؤں میں پنچائتیں قائم کیں۔ غرضیکہ اپنے راہنماؤں کی قیادت اور رفقاء کی معاونت سے علاقہ بھر میں تحریک کو ایک نئی زندگی اور زندگی کو ایک نئی تفسیر عطا کر دی۔ اس زمانہ میں سیاسی تحریکوں میں شرکت آگ سے کھیلنے کے مترادف تھی۔ چنانچہ اس تگ و تاز، سعی و عمل کی شدید مخالفتیں ہوئیں لیکن اس شعلہ جوالہ نے کسی کی کبھی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی مساعی کو جاری رکھا۔ یہ سلسلہ ۱۹۲۹ء تک قائم رہا۔ جب افغان جرگہ وجود میں آیا اور رضاکاروں کا نام "خدائی خدمتگار" رکھا گیا جو عوام میں سرخپوشوں کے نام سے متعارف ہوئے۔ اس زمانہ میں خدائی خدمتگاروں کے مقاصد بڑے درخشندہ تھے۔ چنانچہ نواکلی کے اس نوجوان نے سب سرخپوشوں کی تنظیم کا بیڑہ اٹھایا اور چند دنوں میں اسے ایک مستقل جنبش کی شکل دے دی۔ ۱۹۳۰ء میں کانگریس کی سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی تو حکومت نے سرخپوشوں کو خلافِ قانون جماعت قرار دے دیا۔ یہ نوجوان گرفتار ہوا اور چھ ماہ کی قید بامشقت کی سزا بھگتنے کے لئے جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ اس دوران میں حکومت نے سرخپوشوں پر سخت تشدد برتا جس سے یہ تحریک ماند سی پڑ گئی۔ چھ ماہ کے بعد یہ قید سے نکلا تو پھر وہی گرمجوشی پیدا ہو گئی۔ حکومت نے اس کا پھر تعاقب کیا تو یہ مفرور ہو گیا۔ لیکن فراری کی حالت میں بھی اپنا کام بدستور کرتا رہا۔ حتیٰ کہ پھر گرفتار ہو گیا اور جیل بھیج دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد گاندھی ارون سمجھوتہ ہوا تو اسے بھی رہا کر دیا گیا۔ رہا ہونے پر پھر وہی گرمجوشیاں شروع ہو گئیں۔ ۱۹۳۱ء میں دوبارہ سول نافرمانی شروع ہوئی تو یہ صاحب روپوش ہو گئے اور حکومت اور پولیس کے علی الرغم روپوشی کی حالت میں برابر جماعت کی تنظیم کرتے رہے۔ حکومت نے تنگ آ کر ان کے والد اور بھائی کو گرفتار کر لیا۔ جب اس پر بھی آتشِ انتقام سرد نہ ہوئی تو ان کی جائے سکونت کو نیلام کر دیا اور سامانِ زمینداری کو جلا کر خاکستر بنا دیا۔ ان کا ایک قیمتی باغ کاٹ ڈالا اور مال مویشی سب ضبط کر لئے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی گرفتاری پر انعام مقرر کیا۔ ایک مخبر کی سازش سے ان کی گرفتاری عمل میں آئی۔ اور دو سال قید بامشقت کی سزا پا کر پھر حوالۂ قید و بند ہو گئے۔ قید کے بعد رہا ہوئے تو عام انتخابات کا زمانہ تھا۔ انہوں نے انتخابات میں اس برق رفتاری سے کام کیا کہ کانگریسی اراکین کی اکثریت سے ڈاکٹر خان کی وزارت قائم ہو گئی۔ اس فتح و کامرانی کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو سرحد تشریف لائے۔ اب یہ نوجوان، خان عبدالغفار خان کا دستِ راست اور صفِ اول کے راہنماؤں میں شمار کیا جاتا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ کانگریس کے ایک ایسے

ذمہ دار لیڈر سے اس کی بے تکلف گفتگو ہوئی۔ اس کی نگہ ژرف بین و دوررس نے فوراً بھانپ لیا کہ ہندو کے عزائم کیا ہیں۔ اب ذرا سوچئے کہ حالات کیا تھے؟ صوبہ میں کانگریس کی وزارت تھی۔ پورے علاقہ میں سرخپوشوں کا راج تھا۔ خان عبدالغفار خان (ملنگ بابا) کی گویا پرستش ہوتی تھی۔ شہرت، عزت، مقبولیت، قوت سب ایک طرف تھیں۔ لیکن جب اس مخلص نوجوان نے محسوس کیا کہ سرخپوشوں کو کسطرح ہندو عزائم کے لئے آلۂ کار بنایا جا رہا ہے تو اس نے ایک ثانیہ کے تامل کے بغیر عبدالغفار خان اور اس کے دوسرے ساتھیوں سے ملت حنیفیہ کے مؤسس اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ کے اتباع میں، اعلانیہ کہہ دیا کہ: انا براؤا منکم ومما تعبدون من دون اللہ (۶۰:۴) ہم تم سے اور ان سب سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر محکومیت اختیار کئے ہوئے ہو قطع تعلق کا اعلان کرتے ہیں۔ کفرنا بکم وبدا بیننا وبینکم العداوۃ والبغضاء ابدا حتی تؤمنوا باللہ وحدہ "ہم تم سے بیزار ہیں۔ تم میں اور ہم میں کھلی ہوئی دشمنی اور عداوت رہے گی تاآنکہ تم ایک اللہ کی چوکھٹ پر نہ جھک جاؤ" اس اعلان نے سارے علاقہ میں سنسنی پیدا کر دی۔ خان عبدالغفار خان باور ہی نہیں کر سکتا تھا کہ ایسا بھی ممکن ہے۔ وہ خود چل کر نوا کلی آیا اور دو دن تک ان سے مصروف افہام وتفہیم رہا۔ بحث وتمحیص اور ترغیب و ترہیب کے سب حربے کر دیکھے لیکن ایک بے لوث انسان کا ایمان ایسا کمزور نہیں ہوا کرتا کہ ان حربوں سے لغزش میں آجائے۔ گفتگوئے مصالحت ٹوٹی تو ان لوگوں کی طرف سے اذیت رسانیوں کے مختلف حربے بروئے کار آنے شروع ہو گئے لیکن جس مرد خود آگاہ کے عزائم کو انگریز کا تشدد کمزور نہ کر سکا تھا، اسے کانگریسی اقتدار کی معرفت رسانیاں کیا سرنگوں کر لیتیں؟ ادھر سے تشدد تھا اور ادھر کانگریسی روباہ بازیوں اور دجل فریبیوں کے خلاف ہر جگہ کھلی کھلی تبلیغ لیکن اس وقت تک ان کی یہ تمام مساعی منفیانہ تھیں یعنی کانگریس کی مخالفت۔ یہ اپنی جماعت بنانا نہیں چاہتے تھے اور دوسری کوئی جماعت ایسی تھی نہیں جس میں شامل ہو جاتے۔ اگرچہ اس زمانہ میں ملک میں مسلم لیگ کا چرچا ہو رہا تھا۔ لیکن مسلسل پراپیگنڈا کی رو سے مسلم لیگ کو حکام پرستوں کی جماعت سمجھا جاتا تھا۔ سرحد میں انگریزی حکومت نے اپنے ہمنواؤں سے ایک "اسلامی جرگہ" بنوایا تھا۔ جو عوام میں بے حد بدنام تھا۔ یہی جرگہ اپنے آپ کو مسلم لیگ کا حامی کہا کرتا تھا۔ اس لئے سرحد کا کوئی مخلص کارکن لیگ میں شمولیت کا نام تک نہ لیتا تھا۔

میرا میزبان یہاں تک پہنچا تھا کہ ملازم پھر حقہ لے کر آگیا۔ انہوں نے خشک تمباکو کا ایک کش پھر لگایا اور کہنے لگے کہ یہاں تک بات پہنچی ہے تو بہتر ہے کہ تحریک مسلم لیگ کا پس منظر بھی سامنے آجائے۔ (واضح رہے کہ میرا میزبان ایک خاموش سا مخلص مسلمان تھا جو نظری حیثیت سے سیاسیات سے بڑی گہری دلچسپی رکھا کرتا تھا۔ اس لئے اس اعتبار سے اس کا تجزیہ کوائف وحوادث بڑا صحیح ہوا کرتا تھا) انہوں نے کہا:

آپ کو معلوم ہے کہ انگریز کی حکومت نے، ہر روباہ صفت حکومت کی طرح، ایک ایسے طبقہ کی تخلیق کی تھی جو رعایا اور حکومت کے درمیان حاجب و دربان کا کام دے۔ یہ صوبہ سرحد کی بات نہیں بلکہ سارے ملک میں ایسا کیا گیا تھا۔ قوم حاکم کے رعب اور اقبال کو قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ عوام کو حکام کے قریب نہ آنے دیا جائے۔ لہذا یہ طبقہ جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، پبلک اور افسروں کے درمیان واسطہ بنتا تھا۔ یہ طبقہ دیہاتی زندگی میں بڑے بڑے زمینداروں، نمبرداروں، ذیلداروں اور سفید پوشوں پر مشتمل ہوتا تھا اور شہری زندگی میں نوابوں، خان بہادروں، کرسی نشینوں، آنریری مجسٹریٹوں، میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبروں کو محیط۔ سرحد میں اس طبقہ کو بالعموم خوانین کا گروہ کہا جاتا تھا۔ چونکہ یہ "مرگان حضوری" تھے اس لئے عوام ان سے ڈرتے تھے۔ پبلک کی تمام مشکلات انہی کے توسط سے حل ہوتی تھیں۔ لہذا عوام کے دلوں میں ان کا "جبری احترام" رہتا تھا۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ جس راستے سے کوئی خان بہادر گزر جاتا، دکاندار دست بستہ کھڑے ہو جاتے۔ کوئی معاملہ ان کی مرضی کے خلاف طے نہ ہونے پاتا۔ جس تقریب میں وہ شامل نہ ہوتے

وہ تکمیل تک نہ پہنچ سکتی ۔ حتیٰ کہ لڑکی اور لڑکوں کے رشتے ناطے تک بھی ان کے استصواب کے بغیر قرار نہ پاتے ۔ وہ عجیب زمانہ تھا ۔ ان کی بڑی دھوم تھی ۔

تحریک آزادی نے (جسے ہندوؤں کی زبان میں تحریک سوراج اور مسلمانوں کے الفاظ میں تحریک خلافت کہا جاتا تھا) عزت و احترام کے معیار بدل دیئے اور رفتہ رفتہ حالت یہ ہوگئی کہ وہی نواب اور کرسی نشین، وہی سردار اور خان، جن کی گزرگاہوں پر لوگ دو رویہ تعظیم کے لئے کھڑے رہا کرتے تھے، منہ چھپا کر گھروں میں بیٹھ گئے اور ان کے دروازوں پر "ٹوڈی بچہ ہائے ہائے" کے ماتم کی صدائیں بلند ہونا شروع ہوگئیں ۔ اب ان کی کیفیت یہ تھی کہ اگر انہیں کسی اپنی غرض کے لئے بھی حکام کے پاس جانا ہوتا تھا تو رات کی تاریکیوں میں چوروں کی طرح چھپ چھپا کر نکلتے اور دبے پاؤں واپس آتے کہ کسی کی نظر نہ پڑے ۔ کونسل، اسمبلی تو بڑی چیز تھی، اپنے شہر کی میونسپل کمیٹی کی ممبری کے لئے بھی کھڑے ہونے کی جرأت نہ رہی ۔ اگر کوئی کسی حاکم کی مدد کے بھروسے پر کہیں درخواست دے بیٹھا تو اس طرح ذلیل و خوار ہوا کہ کچھ گرہ سے دے کر جان چھڑانا پڑی ۔ ان کے مقابلہ میں لوگوں نے کنگلوں اور بھکاریوں کو امیدوار بنا کر کھڑا کیا اور دھڑلے سے کامیاب بنا دیا ۔ چنانچہ یہ دور پندرہ بیس برس تک جاری رہا اور یہ طبقہ اسی طرح گمنامی کے گوشوں میں منہ چھپائے پڑا رہا، جس طرح سورج کی موجودگی میں چمگادڑیں روپوش ہو جاتی ہیں ۔ آزادی کی تحریک میں یہ لوگ شریک نہیں ہو سکتے تھے اس لئے کہ اس تحریک میں جائدادوں کی ضبطی، نیلامی اور اس کے بعد، حوالاتیں، جیل خانے، چکی کی مشقتیں، مارپیٹ، سامنے نظر آتی تھی ۔ لہذا عزت کے تمام دروازے ان پر بند تھے اور ذلت کی تمام راہیں کشادہ، کہ اتنے میں بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور قلب ملت جناب "قائد اعظمؒ" نے ملت کا مقدمہ، جو سرتاسر حق و انصاف پر مبنی تھا اپنے ہاتھ میں لیا ۔ ہنگامہ آرائیاں اور تلاطم خیزیاں ان کی فطرت سلیم کے خلاف تھیں ۔ وہ تدبر اور دیانت سے مخالفین کو قائل کرنے کے عادی اور داعی تھے ۔ انہیں ضرورت صرف اتنی تھی کہ وہ جس عدالت میں اس عظیم مقدمہ کو لے کر جائیں قوم کی طرف سے مختار نامہ ان کے ہاتھ میں ہو ۔ ہندوؤں نے ان کے اس مطالبہ کی مخالفت کی اور ان کی ہمنوائی میں (دبدبختی سے) مسلمانوں کے اس طبقہ نے بھی جو تحریک آزادی ہند کی گرمجوشیوں میں پیش پیش رہا تھا ایسا ہی کیا ۔ لہذا اس میدان سیاست میں محترم قائد اعظمؒ کے ساتھ کوئی نہ تھا ۔ ان موقعہ پرستوں نے، جو کونوں کھدروں میں چھپے بیٹھے تھے، اس خالی میدان کو غنیمت سمجھا ۔ انہیں محترم قائد کی سلامت روی اور امن پسندی سے یقین تھا کہ اس میدان میں "خطرہ" کی کوئی بات نہیں ۔ لہذا وہ اپنی چھنی ہوئی عزتوں اور کھوئی ہوئی عظمتوں کی بازیابی کے لئے باہر آگئے اور "مسلم لیگ زندہ باد" کے نعروں سے قوم کے ترجمان بن گئے ۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، محترم قائد کو اپنی جماعتی سیاست کی کامیابی کے لئے ضرورت ہی اس قدر تھی کہ جب بھی کہیں ان سے پوچھا جائے، تو یہ کہہ دیں کہ ہاں! قوم کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہے اور ہمارے مختار کار مسلم لیگ کے صدر، محترم قائد اعظمؒ ۔ یہ لوگ نہ پہلے، سرکار کے طرفدار کسی عقیدہ اور یقین کی بنا پر ہوئے تھے، نہ اب مسلم لیگ کے حامی کسی ملی نصب العین کے پیش نظر ۔ وہ بھی موقعہ پرستی تھی اور یہ بھی موقعہ پرستی ۔ قائد اعظمؒ کی فراست اور اخلاص نے اس جماعت مسلم لیگ کا وقار جو درحقیقت ان کی ذات سے منسوب تھی، آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا، اور یوں لکڑی کے ساتھ یہ لوہا بھی تیرنے لگا ۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، اس تحریک میں خطرہ کی تو کوئی بات تھی ہی نہیں ۔ تھوڑا سا خرچہ ضرور تھا سو اس عزت کے مقابلہ میں جو انہیں اس طرح حاصل ہو رہی تھی، یہ سودا گراں نہیں تھا ۔ اب وہی ٹوڈی بچے، جن کا ماتم "ہائے ہائے" سے ہوا کرتا تھا "زندہ باد" کے نعروں میں حیات جاوید کے مستحق قرار پا رہے تھے!

یہ تو تھی ملک کی عمومی حالت ۔ صوبہ سرحد میں یہ تفاوت اور بھی نمایاں تھا ۔ یہاں سرخ پوشوں کی تحریک کو دبانے کے لئے انگریز نے ان سرکار پرست نوابوں، سرداروں، "موجب خواروں" اور وظیفہ یابوں کو خاص طور پر استعمال کیا تھا ۔ وہ جس قدر ظلم و تشدد چاہتا

تھا، انہی کے ہاتھوں سے کراتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ صوبہ کے ایک ایک گھرانے میں ان سرکار پرستوں کے خلاف جذبات انتقام و غضب ابل رہے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جن سے "اسلامی جرگہ" عبارت تھا اور بدقسمتی سے یہی وہ تھے جو شروع شروع میں مسلم لیگ کے حامی بن گئے تھے۔ اب آپ خود ہی خیال فرمالیجئے کہ اس مسلم لیگ میں سرحد کا مسلمان کس طرح شریک ہو جاتا۔ کانگریسی مسلمان، لیگ کو انگریزوں کی خود ساختہ جماعت کہا کرتے تھے اور اس کے لئے انہیں کسی دلیل کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیگ کے حمایتی ان کے اس الزام کی زندہ دلیل تھے۔

یہ تھے وہ حالات جن میں نوانکلی کے اس "باغی سرخپوش" نے کانگریس کی مخالفت شروع کی تھی۔ اس کی فراستِ مومنانہ نے اسے اس نتیجہ پر پہنچا دیا کہ مسلمان کے لئے لیگ کی حمایت ہی صحیح مسلک ہے۔ اب یہ مرحلہ، پہلے مرحلہ سے بھی زیادہ حوصلہ طلب تھا۔ وہاں تو صرف کانگریسی رفقا اور سرخپوشی کی جماعت سے کٹ کر الگ ہو جانا تھا۔ یہاں اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ پیوست کرنا تھا جو اپنی سرکار پرستی میں گلی کوچے میں بدنام تھے۔ غور کیجئے۔ یہ مرحلہ کس قدر دشوار گزار اور ہمت طلب تھا لیکن اخلاص کے سامنے کوئی مرحلہ بھی مشکل نہیں ہوا کرتا۔ قائداعظمؒ نے اپیل کی کہ "مسلمانوں کے گھروں میں آگ لگ رہی ہے اور میں خطرہ کی گھنٹی بجا رہا ہوں۔ کوئی ہے جو اس کام میں میرا ساتھ دے"۔ نوانکلی کے مردِ مجاہد نے اس درد بھری اپیل کو سنا اور لبیک لبیک کہتا ہوا، ننگ و نام کی پروا کئے بغیر، مستانہ وار لیگ میں جا شامل ہوا۔ خود بھی اور اس کے جاں نثار رفیقوں کی جماعت بھی۔ کانگریسی زعما اور سرخپوشوں کے اباطیل نے ایک شور مچا دیا کہ یہ بھی ٹوڈی ہو گئے۔ لیکن سرحد کے مسلمانوں کے سامنے اس مردِ قلندر کی ساری زندگی تھی۔ وہ علی وجہ البصیرت جانتے تھے کہ سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ شخص انگریز پرست ہو جائے۔ لہٰذا جس طرح ان حکام پرست لیگیوں کا وجود ہی لیگ کو سرکار پرست جماعت قرار دینے کی زندہ شہادت تھا، اسی طرح اس مردِ بے باک اور اس کے رفقاء کی لیگ میں شمولیت، لیگ کو سرکار پرستی کے مطعون قبیل سے بچانے کی دلیل قاطع اور برہان نیرہ تھی۔ انسان کا کیرکٹر دشمنوں سے بھی اس کا لوہا منوا لیتا ہے۔ پہلا بحران ختم ہونے کے بعد حالت یہ ہو گئی کہ جب کبھی کانگریسیوں کی طرف سے یہ طعن دیا جاتا کہ لیگ انگریز پرستوں کی جماعت ہے، اور جواب میں یہ کہہ دیا جاتا کہ کیا ارباب نوانکلی بھی انگریز پرست ہیں، تو ان کا منہ بند ہو جاتا۔

اب لیگ کچھ اور تھی۔ اب گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ لیگیں بننی شروع ہو گئیں۔ ۱۹۴۰ء میں یہ مردِ مجاہد، تحصیل صوابی کی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ بس اس دن سے ان کا نام ہی "صدر صاحب" ہو گیا۔ صدر صاحب ایک غریب زمیندار تھے۔ اپنا اثاثہ پہلے لٹا چکے تھے۔ لیگ کی تنظیم کے لئے روپیہ کہاں سے آتا؟ پہلے اپنا مکان رہن رکھا۔ پھر زمین رہن رکھی (یہ چیزیں حکومت کانگریس کے زمانہ میں واگذار ہو گئی تھیں۔) یہ سال بھر دورے میں رہتے۔ اس لئے کھیتی باڑی کی نگرانی کس طرح ممکن تھی؟ بہرحال سارا صوبہ ان کا مداح خواں اور ستائش گر تھا۔ ان کے لئے سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ لوگ ان نوابوں اور سرداروں پر اعتراضات کرتے تھے جو لیگ کے سربراہ بن رہے تھے۔ اس زہر کا اثر زائل کرنے کیلئے انہیں اشخاص اور اصول کے فرق کو ذہن نشین کرانا پڑتا تھا جو ایک مشکل کام تھا۔ لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے اخلاص و کردار سے علاقہ بھر کو لیگ کا گرویدہ بنا دیا۔ "اس جہاں گردی" سے کھیتی باڑی کا سب دھندا برباد ہو گیا۔ اور گھربار کے اخراجات بھی قرض سے چلنے لگے۔ اپنے علاقہ میں تو پھر بھی مکی کی روٹیاں چادر میں باندھ کر پاپیادہ سفر ہو جاتا تھا۔ لیکن مشکل اس وقت آتی تھی جب لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لئے باہر جانا پڑتا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ لیگ کے ہر اجلاس

میں شرکت کے لئے انہیں ایک ایک کھیت رہن رکھنا پڑتا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں صوبے کے انتخابات ہوئے اور صدر صاحب صوبہ مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔

جب مسلم لیگ کو اس طرح مقبولیت حاصل ہو گئی تو قوت و جاہ طلب افراد کے دلوں میں وزارت کا شوق انگڑائیاں لینے لگا۔ "صدر صاحب" نے انہیں اس ارادہ سے روکا۔ ان کا یہ فیصلہ نہایت تدبر و فراست اور دور اندیشی پر مبنی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس وقت لیگ کا جو بھرم بنا ہوا ہے وہ ان ارباب ہوس کی اقتدار پرستیوں سے خاک میں مل جائے گی۔ لیکن ان کی کسی نے نہ مانی اور...... نے لیگ وزارت مرتب کر لی۔"

اب ملازم قہوہ لے کر آ گیا اور میرے میزبان نے ایک فنجان مجھے دیا اور ایک خود اٹھایا۔ "صدر صاحب" کے متعلق داستان اس قدر دلچسپ تھی کہ میں چاہتا تھا کہ قہوہ کا فنجان جلدی سے ختم ہو جائے۔ لیکن پٹھان ایسا گرم قہوہ پیتے ہیں کہ اسے سانس کے زور سے کھینچ کر پینا (بلکہ یوں کہئے کہ چکھنا) پڑتا ہے۔ پیالی ختم ہوئی تو میرے میزبان نے سلسلہ کلام کو پھر جاری کیا اور فرمایا۔

"اب سنو کہ کیا ہوا۔ وہی صدر صاحب جن کی مساعی کے صدقے ان خوانین کو یہ مسانید حکومت و اقتدار نصیب ہوئی تھیں ان کی نگاہوں میں کھٹکنے لگ گئے۔ اس لئے کہ وہ برابر وا حرکت پر روکتے تھے اور بحیثیت صدر مسلم لیگ ان کی کارروائیوں کا کڑا جائزہ لیتے تھے۔ لہذا سوچا یہ گیا کہ اس کانٹے ہی کو پہلو سے نکال دینا چاہیئے۔ چنانچہ آئین و قوانین کی تمام پابندیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے...... ورفقاء ہم نے...... کے ایک صاحب کو صوبہ لیگ کا صدر بنا دیا اور صدر صاحب کو صدارت سے الگ کر دیا۔ اس فیصلہ سے سارے علاقہ میں آگ لگ گئی ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس آگ کا بجھانے والا کون ہے؟ خود "صدر صاحب"! یہ جگہ جگہ پھر رہے ہیں اور لوگوں کی منتیں کر رہے ہیں کہ خدا کے لئے لیگ کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ آج کے جس جلسہ میں آپ گئے تھے، وہ بھی اسی غرض کے لئے منعقد ہوا تھا۔ لوگ تلے بیٹھے تھے کہ لیگ کو درہم برہم کر دیا جائے۔ وہ "صدر صاحب اور لیگ" کو دو الگ الگ چیزیں تصور ہی نہیں کر سکتے۔ ان کا یہی فیصلہ تھا لیکن اس فیصلہ کو الٹ دینے والے یہی صدر صاحب تھے۔ یہ تماشا تو آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔"

اس وقت نصف شب کے قریب گذر چکی تھی۔ میرا میزبان مجھے شب بخیر کہہ کر چلا گیا اور میرے لئے تصورات کی ایک دنیا پیچھے چھوڑ گیا۔ میں حیران تھا کہ بارالٰہا! ہم میں ایسے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کی سیرت کی بلندی اور کردار کی پختگی کا یہ عالم ہے۔ میں اس سے پیشتر یہ باور کرنے کے لئے بھی تیار نہ تھا کہ ہمارے برسے ہوئے بادلوں میں ہنوز ایسی ایسی بجلیاں پوشیدہ ہیں۔ علی الصبح میں بغیر کسی کو اطلاع دیئے نوانکلی جا نکلا تاکہ اس مرد مومن کے ہاتھوں کو بوسہ دے سکوں۔ لیکن وہ گذشتہ شب کسی اور طرف "دورہ" پر نکل گئے تھے۔ وہاں بہرحال میں ان کے رفقائے کار سے ملا اور ان سے بھی بہت کچھ سُنا۔ صدق مقال اور اکل حلال کی جن داستانوں کو ہم کتابوں میں پڑھا کرتے تھے اس کا آنکھوں دیکھا حال نوانکلی کے ان لوگوں کی زبانی سُنا۔

اب صوبہ کی حکومت نے، ہر مستبد حکومت کی طرح، صدر صاحب اور ان کے ساتھیوں کو طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ الزام تراشی، تہمت طرازی، پولیس کی نگرانی وقس علیٰ ذلک۔ ہر وہ حربہ جو حق گوئی اور بے باکی کے جرم میں استعمال ہوتا چلا آیا ہے، استعمال کیا گیا۔ وہ اس قسم کی اذیت رسانیوں میں مصروف تھے اور صدر صاحب اس کوشش میں سرگرم مارے مارے پھر رہے تھے کہ عوام، لیگ کے خلاف نہ ہو جائیں۔ لیکن اب یہ ناسور، صدر صاحب کی کوششوں سے اچھا نہیں ہو سکتا تھا۔ اب اس ناسور کو انسان کی دعائیں بچا نہیں سکتی تھیں۔ لیگ حکومت کی بدعنوانیاں اور بے ضابطگیاں اس درجہ بڑھ چکی تھیں کہ وہ پٹھان جنہیں انگریز

کے تصور سے نفرت تھی، دعائیں مانگتے تھے کہ اس حکومت کے بدلے دفعہ ۹۳ کے ماتحت گورنری راج ہی آجائے۔ یہی تھے وہ اسباب جن کی بناء پر صدر صاحب صوبہ میں لیگ وزارت کے قیام کے خلاف تھے۔ لیکن اس معاملہ میں بھی خود صدر صاحب سب سے بڑھ کر مشکل میں تھے۔ کانگریسی مسلمان جگہ جگہ انہیں طعن دیا کرتے تھے کہ کیوں! یہی ہے وہ آزاد حکومت جس کے لئے تم ہم سب سے الگ ہوئے تھے۔ مسلم لیگی عوام جو محض صدر صاحب کی کوششوں سے لیگ میں شامل ہوئے تھے حکومت کی ہر بدعنوانی کے لئے صاحب صدر کو مورد الزام ٹھہراتے تھے کہ

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اور حکومت کا ان کے ساتھ جو سلوک تھا اسے ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود لیگ کے مقصد سے ان کا عشق تھا کہ انہیں لئے لئے پھر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ لیگ وزارت سخت بدنام ہو گئی اور اس کے بعد وہ خود اپنے بوجھ ہی سے ٹوٹ گئی۔ صدر صاحب نے قیام وزارت سے پہلے ہی اس کے انجام کے متعلق جو کچھ کہہ رکھا تھا، وہی کچھ ہو کر رہا۔ اب پھر ڈاکٹر خاں صاحب کی وزارت برسر اقتدار تھی اور لیگ کے لئے حالات سخت ناسازگار اور صدر صاحب کے لئے فضا بے حد ناسازگار۔ لیکن وہ اس پر بھی برابر مصروف سعی و عمل رہے کہ ناسازگار ماحول سے متاثر ہو کر مایوس ہو جانا ان کی فطرت ہی میں نہیں۔

۱۹۴۶ء میں بمبئی میں فسادات ہوئے تو سرحد سے ایک تحقیقاتی کمیٹی، صدر صاحب کی صدارت میں تفتیش حالات کے لئے بمبئی گئی۔ وہاں سے واپسی پر صدر صاحب کو دہلی میں معلوم ہوا کہ پنڈت جواہر لال نہرو پھر سرحد جانے والے ہیں۔ صدر صاحب کی نگاہ اس موقعہ کی اہمیت کو بھانپ گئی۔ انہوں نے وہیں سے پراونشل مسلم لیگ سرحد کے سیکرٹری کو تار دیا کہ صوبہ لیگ کا ایک اجلاس خصوصی فوراً طلب کیا جائے۔ صدر صاحب خود پنڈت جواہر لال کے سرحد پہنچنے سے تین دن قبل پشاور پہنچ گئے اور لیگ کے اجلاس میں اس مسئلہ کی اہمیت کو اس طرح واضح کیا کہ اراکین کو اپنے ساتھ ہم نوا کر لیا۔ اس تین دن میں، صدر صاحب اور ان کے رفقائے کار نے وہاں کیا کچھ کیا، اس کا جواب اس سے لیجئے کہ جواہر لال صاحب کے ساتھ سرحد میں کیا کچھ ہوا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس میں بہت سے دیگر دردمند اور صاحب ہمت حضرات کی کوششیں بھی شامل تھیں لیکن صدر صاحب اور ان کے رفقاء کا اس میں نمایاں حصہ تھا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں ڈاکٹر خاں صاحب کے بنگلہ پر حملہ کرنے کے الزام میں صدر صاحب پر مقدمہ بھی چلایا گیا۔

اسی دوران میں حلقہ مردان میں ایک ضمنی انتخاب سامنے آیا جس کے متعلق ڈاکٹر خاں صاحب نے دہلی سے چیلنج دیا تھا کہ کانگریس اور لیگ کی فتح و شکست کا مدار اسی انتخاب پر ہے۔ یہ صدر صاحب کا اپنا علاقہ تھا۔ اس میں انہوں نے اس تن دہی اور جانفروشی سے کام کیا کہ اللہ کی نصرت نے ان کی مساعی کو کامرانی سے نوازا۔ اور انتخاب لیگ کے حق میں ہوا۔ اب صدر صاحب نے بھانپ لیا تھا کہ صوبہ میں کانگریس کا زور توڑنے کے لئے حکومت سے تصادم ضروری ہے۔ لہٰذا انہوں نے مردان سے سول نافرمانی کی ابتداء کر دی اور پھر پشاور پہنچ کر اسے وسیع پیمانے پر پھیلانے کا پروگرام مرتب کر لیا۔ اتنا کرنے پائے تھے کہ حکومت نے انہیں گرفتار کر کے جیل خانہ بھجوا دیا۔ اس موقعہ پر قدرت نے حضرت پیر صاحب مانکی شریف (اعلی اللہ مدارجہم) کو اس طرف متوجہ فرما دیا۔ اور انہوں نے اس ہمت، جرأت اور بہادری سے اس تحریک کو کامیاب بنایا کہ اس کی مثال نہیں مل سکتی (حضرت پیر صاحب کے مجاہدانہ تگ و تاز اور اس کا "صلہ" ایک الگ داستان ہے اور فرصت کی محتاج) صدر صاحب کو جیل گئے قریب چھ ماہ ہوئے تھے کہ سرحد میں ریفرنڈم کا چرچہ ہوا۔ اب جان کی رہائی ہوئی ہے تو انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ حق اور باطل کا آخری معرکہ ہے۔ اس معرکہ میں حق کی کامیابی کے لئے صدر صاحب نے صوبہ بھر میں بگولے کا سا رقص کیا اور وہاں کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیا۔ ادھر پیر صاحب مانکی شریف کی مجاہدانہ مساعی

نے فضا کا رنگ بدل دیا) اللہ نے ان مخلص کارکنوں کی کوششوں کو اپنی توفیق و تائید سے نوازا اور سرحد میں ہندو کی سازشیں ختم ہوگئیں۔ والحمد للہ علی ذالک۔

اس کے بعد پھر لیگ وزارت قائم ہوگئی اور پھر وہی خود غرضانہ دسیسہ کاریاں شروع ہوگئیں۔ حضرت پیر صاحب کے ساتھ وہاں کیا کیا گیا، یہی حدیث کچھ کم جگر خراش نہیں۔ لیکن اس سے کہیں الم انگیز ہے یہ داستان کہ صوبہ سے اس تشتت و انتشار کو ختم کرنے کے سلسلہ میں صدر صاحب نے جو جدوجہد کی اسے متعلقہ حلقوں میں غلط معنی پہنانے گئے ہے غرض انسان کے ساتھ یہی کچھ ہوا کرتا ہے۔ یہ خلفشار بڑھ رہا تھا کہ اتنے میں جہاد کشمیر شروع ہوگیا اور یہ اللہ کا بندہ وسیدھا میدان جنگ میں جا پہنچا۔

پچھلے دنوں سرحد میں مسلم لیگ کے انتخاب جدید ہوئے اور جس طریق سے یہ انتخاب عمل میں آئے اگر اس کی تفاصیل بیان کی جائیں تو ہر قلب حساس کی نگاہیں شرم سے زمین میں گڑ جائیں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ انتخاب تو ایک طرف رکنیت کے فارم تک بھی ایک خاص حلقہ سے باہر نہیں جانے دیئے گئے۔ اس سلسلہ میں حضرت پیر صاحب مانکی شریف کو جس طرح کراچی کے میکر لگانے پڑے وہ ہم سب کے سامنے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ فارم صدر صاحب اور ان کے رفقائے کار (یا حضرت پیر صاحب اور ان کی جماعت) کو کبھی نہیں مل سکتے تھے۔ ان جیسے "باغیوں" کا بھلا لیگ میں کیا کام؟

اب صورت یہ ہے کہ ٹو انکلی کا یہ مرد مجاہد جس کی تمام عمر مسلمانوں کو سر بلند دیکھنے اور اپنے صوبہ میں پاکستان کا علم بلند کرنے میں صرف ہوگئی اور جس نے اس مقصد عزیز کے حصول کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیا، اب پاکستان کی "اسلامی حکومت" میں اپنے گاؤں کے ایک حجرے میں معتوب و مغضوب پڑا ہے۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس "کانٹے" کو پہلو سے نکالنے کے لئے ارباب ہوس و اقتدار کس کس قسم کے نشتر استعمال کریں۔ جرم اس کا صرف یہی ہے کہ قالوا ربنا اللہ۔ یہ کہتا ہے کہ جھکنا صرف خدا کے حضور جائز ہے اور سب اس کے بندے اور مخلوق خدا کے خادم ہیں۔ وہ کہتا یہ ہے کہ جن مقاصد کا اعلان کر کے قوم کو دعویٰ پاکستان کا ہمنوا بنایا تھا ان وعدوں کو پورا کرو۔ خدا کے بندوں کو خدا کی محکومی میں رکھو۔ پاکستان کو غریبوں کی امیدوں کا ماویٰ و ملجا بننے دو۔ اسے اپنی کامرانیوں کا جہنم نہ بناؤ۔ آج ایسا کہنے والے کی سزا اس سے بھی سخت ہونی چاہیئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر صدر صاحب آج بھی چاہیں تو صوبہ میں لیگ کے مقابل ایک فعال جماعت قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ ملت میں تفرقہ کسی قیمت پر بھی جائز نہیں سمجھتے۔ اس لئے وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ خود مٹ جائیں گے لیکن قوم میں تفرقہ پیدا نہیں ہونے دیں گے۔

بہرحال یہ ہیں مختصر سے کوائف زندگی معماران پاکستان میں سے اس ایک کے جس کی ہڈیوں کے چونے اور لہو کی سرخی سے یہ قصر جمیل تیار ہوا ہے اور جو اب ارباب ہوس کا عشرت کدہ بن رہا ہے۔

اگر آپ اس مرد مجاہد سے ملنا چاہیں تو ضلع مردان کے گاؤں ٹو انکلی میں جائیے۔ وہاں "بخت جمال خان" کہہ کر نہ پوچھئے کہ گاؤں کے نو عمر لڑکے اس نام سے آشنا نہ ہونگے۔ "صدر صاحب" کہہ کر دریافت کیجئے تو پانچ سال کا بچہ بھی آپ کو سیدھا اس کھیت کی طرف لے جائیگا جہاں پاکستان کا یہ بطل جلیل کہ جس کا مقام آج اس قدر بلند ہونا چاہیئے تھا، گھاس کھود رہا ہوگا۔ (۱۹۴۹ء)

اضافہ

(پرویز)

اب اسے ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

یہ ۱۹۴۹ء تک کی داستان ہے۔ مجھے اس میں اس مقام پر ایک کڑی کا اضافہ کرنا ہے جہاں یہ کہا گیا ہے کہ یہ مرد مجاہد

کسطرح کانگریس (سرخپوشوں کی جماعت) سے کٹ کر مسلم لیگ کی طرف آیا۔

طلوعِ اسلام ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا۔ مقصد اس کا مطالبۂ پاکستان کی تائید و حمایت تھا کہ یہ مطالبہ اس کے نزدیک دین کا تقاضا تھا۔ اگرچہ اس کے مدِ مقابل نیشنلسٹ مسلمانوں کی تمام جماعتیں تھیں، لیکن اس کا خصوصی محاذ، قومیت پرست "علماء" کا گروہ تھا جو مذہب کے نام پر عوام کو اس تحریک سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بنابریں، طلوعِ اسلام میں جو کچھ شائع ہوتا وہ کتاب و سنت کی تعلیم پر مبنی ہوتا تھا۔ میں اگرچہ اس زمانے میں سرکاری ملازمت میں منسلک تھا۔ لیکن اس کا ہر ایک کو علم تھا کہ اس قرآنی فکر کا سرچشمہ کہاں ہے۔ میری قیامگاہ ان سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتی تھی۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک شام وہی بزرگ (جو بعد میں "صدر صاحب" کے لقب سے پکارے گئے) میرے ہاں تشریف لائے۔ بڑے غصے میں بھرے ہوئے۔ نظر آتا تھا کہ وہ جنگ کے لئے بالکل تیار ہیں۔ لیکن میں نے (حسبِ معمول) لینت اختیار کی۔ چند ہی ثانیوں کے بعد میں نے محسوس کر لیا کہ ان کا وہ غم و غصہ اور جوش و خروش خلوص پر مبنی ہے۔ وہ دیانتداری سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ کانگریس کی تحریک مسلمانوں (بلکہ اسلام) کے لئے مفید ہے۔ میں نے انہیں کتاب و سنت کی روشنی میں مطالبۂ پاکستان کی کیفیت، ماہیت، علت، اور غائت سمجھانے کی کوشش کی۔ دوسری یا تیسری نشست میں انہوں نے اسی جوش اور ولولے کے ساتھ کہہ دیا کہ میں سمجھ گیا مسلمانوں کے لئے ایک ایسی آزاد مملکت کا قیام جس میں قرآنی نظام رائج ہو، دین کا تقاضا ہے اور اس کے لئے ہر ممکن کوشش اسلامی جہاد۔ یہ کہہ کر وہ میرے ہاں سے اٹھے اور سیدھے سرحد چلے گئے اور وہاں جا کر سرخپوشوں سے علیحدگی کا وہ اعلان کر دیا جس کا ذکر آپ اوپر پڑھ چکے ہیں۔ میرے ساتھ ان کا یہ قلبی رشتہ جو اُس زمانے میں استوار ہوا دن بدن بڑھتا گیا اور آخری وقت تک قائم رہا۔ میرے ہاں ان کی کیفیت بالکل گھر کے بزرگ کی سی تھی۔ یہاں کے بچے ان کی گود کے پروردہ تھے۔ لہٰذا وہ جب بھی تشریف لاتے، مجھے نہ کسی قسم کا تردد کرنا پڑتا، نہ کوئی خاص اہتمام۔ (ویسے بھی ان کی زندگی ایسی سادہ تھی کہ ان کے لئے کسی قسم کے اہتمام کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی)۔ وہ بچوں میں بالکل بچے بن جاتے تھے۔ انہیں ان سے بڑا پیار اور انہیں ان سے بڑی محبت تھی۔

میری قرآنی فکر سے انہیں والہانہ دلبستگی تھی۔ وہ اس کے سفیرِ رواں تھے۔ انہوں نے اس شمعِ قرآنی کی روشنی سرحد کی تیرہ و تار چٹانوں تک پہنچا دی۔ صوبہ سرحد اپنی متشدد قدامت پرستی کے لئے مشہور ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس میں ان کی کس قدر مخالفت ہوتی ہوگی۔ لیکن انہوں نے یہ سب کچھ نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ وہ طلوعِ اسلام کی ہر کنونشن میں نہایت جذب و شوق اور جوش و ولولے کے ساتھ شریک ہوتے۔ اور ان کی ایمانی حرارت اس تحریک کے پروگراموں میں بڑی حدت اور گرمجوشی پیدا کر دیتی۔ ان کا وجود فی الحقیقت روشنی کا مینار تھا اور ان کے معصومانہ قہقہے بانگِ درا۔

لیکن ادھر سے ہٹ کر آپ پھر وہیں پہنچئے جہاں "حق شناسی" سلے ۱۹۴۷ء تک ہمیں پہنچا یا تھا۔ سرحد کی مسلم لیگی حکومت کو ان کا اپنے گاؤں میں گھاس کھودنا بھی خوش نہ آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ ان کی حق گوئی اور بے باکی، اور دوسری طرف عوام میں ان کی بے پناہ مقبولیت سے ہر وقت خائف رہتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ان کو جلاوطن ہونا پڑا۔ وہ کراچی آگئے اور وہاں نہایت خاموشی سے تمباکو فروشی کا کچھ دھندا شروع کیا۔ لیکن کہاں صدر رجنٹ جمال خاں اور کہاں تمباکو فروشی! اس میں انہیں ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد ان پہ کیا گزرتی رہی، میں ان جگر سوز تفاصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ بس اتنے پر ہی اکتفا کرنا چاہتا ہوں کہ ان کی زندگی کے آخری سال گمنامی ہی میں نہیں بلکہ اس قدر صعوبات، تفکرات اور پریشانیوں میں گزرے کہ ان کے تصور سے دل کا خون آنکھوں میں کھنچ آتا ہے لیکن اس مردِ غیور نے کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کیا۔ تحریک کے زمانے کے رفقاء میں سے اکثر اقتدار کی کرسیوں پر متمکن تھے۔

انہوں نے کسی کے دروازے پر دستک نہ دی۔ مجھے انتہائی رنج ہی نہیں بلکہ صدمہ اس بات کا ہے کہ ان حضرات کو ان کی پریشانیوں کا علم اور ان پر جس قدر زیادتیاں ہوئیں، ان کی خبر تھی۔ لیکن ان میں سے کسی نے ان کی مدد کرنا تو ایک طرف، اظہار ہمدردی تک بھی نہ کیا۔ وہ طلوعِ اسلام کنونشن (منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۴ء) میں تشریف لائے تو ان کی صحت بہت گر چکی تھی۔ (بایں ہمہ، ان کے جوش و ولولہ اور سرگرمیٔ عمل میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی تھی) میں نے محسوس کر لیا کہ اب یہ دیوار گرا ہی چاہتی ہے۔ چنانچہ ۲۴ فروری ۱۹۷۵ء کی شب مجھے نوانکلی سے ٹیلیفون پر اطلاع ملی کہ صدر صاحب نہایت خاموشی سے اس دنیا کو چھوڑ کر وہاں چلے گئے جہاں سے ان کی آواز کبھی بھی سنائی نہیں دینے کی۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔ کہ ؎

دہر میں اک چراغ تھا، نہ رہا ......

مجھے کوئی ایسا ذریعۂ سفر میسر نہ آسکا کہ ان کے جنازہ میں شرکت کر سکتا۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان کے جنازہ میں کون کون شریک ہوا قیاس یہی ہے کہ یہ گاؤں کے لوگوں تک ہی محدود رہا ہوگا۔ اتنا ہی نہیں، میں نے کسی اخبار میں ان کی وفات کی خبر تک نہیں دیکھی۔ اگر سرحد کے کسی مقامی اخبار میں کوئی خبر شائع ہوئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا، آہ! کس قدر احسان فراموش ہے ہماری قوم! میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ اگر یہ شیرِ پنجاب، مسلکِ قومیت پرستی کو چھوڑ کر تحریکِ پاکستان کا مؤید نہ بنتا تو پاکستان وجود میں نہ آتا۔ لیکن اتنا تو بلا شائبۂ تردید اور اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس صورت میں کم از کم صوبہ سرحد پاکستان کا حصّہ نہ بن سکتا۔ اور اس کے جو نتائج ہوتے ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تھا مقام اس محسنِ ملت کا، جسے اس کی قوم نے جیتے جی اپنے ہاتھوں دفن کر دیا۔ اور جس کی موت پر اس کی آنکھ سے ایک قطرۂ اشک تک نہ ٹپکا!

اے پیکرِ صدق و صفا! اے مجسمۂ خلوص و محبت!! اے محسنِ ملت! اے معمارِ پاکستان! اے فدائی اسلام! اے پروانۂ شمعِ قرآن! خدا آپ کو اپنے سحابِ کرم کے سایۂ عاطفت میں رکھے۔ طوبیٰ لکم وحسن مآب۔

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

[یہ تھا مختصر سا تعارف، تعمیرِ پاکستان کی بنیاد کی ایک نہایت مستحکم اینٹ کا۔ کسی کو کیا معلوم کہ اس قسم کی کتنی اینٹیں اس طرح تہ خاک مدفون ہیں کہ کسی کو ان کا نام تک یاد نہیں۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔]

دل فگار

پرویز (۱۹۷۵)

احتیاط برتیے!

لفافہ بند کرتے وقت احتیاط سے دیکھئے کہ آپ کا خط لفافہ کی گوند کے ساتھ تو نہیں چپک گیا۔ آج کل اکثر خطوط اس طرح موصول ہوتے ہیں کہ انہیں لفافہ سے چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کئی خطوط پھٹ بھی جاتے ہیں۔ آپ کی تھوڑی سی احتیاط سے آپ کا خط محفوظ طریق سے ہم تک پہنچ جائے گا۔ شکریہ

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

مطالب الفرقان جلد چہارم

پرویز صاحب کے فہم و تفہیم قرآن کے انداز سے آپ واقف ہیں۔ قرآنی الفاظ کے مفہوم کا تعین زمانہ نزولِ قرآن کی عربی زبان کی رُو سے۔ اور آیاتِ قرآنی کا مفہوم خود قرآنِ کریم کی دیگر آیات کی روشنی میں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے پہلے لغات القرآن — مفہوم القرآن — اور — تبویب القرآن مرتب کئے اور پھر تفسیر قرآنِ مجید کا مسلسل سلسلہ شروع کیا۔ اس کی چوتھی جلد، سورۂ آلِ عمران، سورۂ النساء اور سورۂ المائدہ پر مشتمل قریب ساڑھے چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے نمایاں موضوعات یوں سامنے آتے ہیں:-

- آیاتِ محکمات و متشابہات۔
- حضرت زکریاؑ اور یحییٰؑ کے احوال و کوائف۔
- حضرت مریمؑ کی انقلاب انگیز زندگی۔
- حضرت عیسےٰؑ کی داستانِ حیات۔
- بن باپ کی پیدائش کا عقیدہ۔
- مذہبی پیشوائیت کی خود ساختہ خدائی کے خلاف سرکشی۔
- رومن شاہنشاہیت کے خلاف بغاوت۔
- واقعہ صلیب کی تفصیلی سرگزشت۔
- معجزات کی حقیقت۔
- وفات و نزولِ مسیح کی بحث۔
- تحقیقاتِ جدیدہ کی روشنی میں بصیرت افروز انکشافات۔
- اسلامی نظام۔
- سنت اور حدیث کی صحیح پوزیشن۔
- اطاعتِ خدا اور رسول کا قرآنی مفہوم۔
- ترکہ اور وراثت کے احکام اور تقسیم۔
- یتیم پوتے کی وراثت۔
- حدود (جرائم کی قرآنی سزائیں)۔
- قطع ید وغیرہ۔

ان چند ایک عنوانات سے کتاب کے مندرجات کی اہمیت کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ اسے ادارہ طلوعِ اسلام کے اشاعتی معیار کے مطابق، دلکش اور پائیدار انداز سے طبع کیا گیا ہے۔ عام کتابوں کے مقابلہ میں ضخامت کے قریب دُگنا ہو جانے کی وجہ سے قیمت ۔/۹۰ روپے (ڈاک خرچ ۔/۸ روپے) مقرر کی گئی ہے۔

ملنے کے پتے:

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲۔ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور

۲۱ اپریل کی یاد میں

ضربِ کلیم

(ڈاکٹر عبدالوہاب عزام (مرحوم) مصر کے جلیل القدر اہلِ علم تھے۔ علامہ اقبالؒ سے انہیں والہانہ شیفتگی تھی۔ جب وہ بطور سفیرِ مصر پاکستان میں قیام پذیر تھے تو انہوں نے (مجلس قلندرانِ اقبالؒ کے اجتماعات میں) پرویز صاحب سے اقبالؒ کا کلام لفظاً لفظاً سمجھا۔ جتنا حصہ وہ سمجھتے تھے اسے عربی (نظم) میں منتقل کرتے جاتے تھے۔ اسی نہج سے انہوں نے ضربِ کلیم کا منظوم ترجمہ مکمل کر لیا تو اس کا مقدمہ اور تعارف خود تحریر فرمایا اور پیش لفظ پرویز صاحب سے لکھوایا۔

امسال یومِ اقبالؒ کی تقریب پر ہم، ان ہر سہ نوادرات کا اردو ترجمہ پیش خدمت کرتے ہیں۔)

---(۰)---

(۱) مقدمہ

(ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، مرحوم)

خدایا! ہم تجھ ہی سے توفیق و ہدایت کے طلبگار ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے شاعر فیلسوف ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے فارسی دیوان، پیامِ مشرق کا عربی ترجمہ دس ماہ میں تیار ہو گیا۔ اپریل ۱۹۵۱ء میں علامہ مرحوم کی تیرھویں برسی کے موقع پر یہ عربی دیوان کراچی میں چھپ کر شائع ہوا اور مجلسِ اقبالؒ نے یومِ اقبالؒ کے سرکاری اجتماع میں اس کو پاکستان کے گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔

عربی میں اقبالؒ کے کلام کا یہ ترجمہ مرحوم کی دلی تمنا اور میری ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل تھی۔ آخرکار وہ منزل آ گئی جس کی طرف میں نے بارہا قدم بڑھانے کی کوشش کی لیکن مصروفیتیں ہمیشہ سدِراہ ہوتی رہی تھیں۔

"پیامِ مشرق" کے اس عربی ترجمہ "رسالۃ المشرق" نے پاکستان کے اہلِ علم، ادیب اور سیاسی طبقہ میں غیر معمولی اثرات پیدا کئے اور عربی خواں طبقہ میں اس کو خاص طور پر مقبولیت حاصل ہوئی۔

اس کامیابی نے مجھے اسی راہ پر گامزن رہنے کی دعوت دی کہ اس عظیم المرتبہ شاعر کے دوسرے دیوانوں کو بھی عربی

میں منتقل کروں۔ اور اس تحریک نے مجھے اس کام کو جس کی خود میں نے ہی ابتدا کی تھی، جاری رکھنے اور اس کے لئے دشواریاں برداشت کرنے پر آمادہ رکھا۔ "رسالۃ الشرق" کی اس مقبولیت ہی کا نتیجہ تھا کہ بہت سے پاکستانی احباب اور متعارفین ایک دوسرے ترجمہ کی امید میں میری طرف آنکھیں لگائے ہوئے تھے۔

"پیامِ مشرق" کے ترجمہ کے بعد میں نے اس مقصد کے لئے "جاوید نامہ" کو تجویز کیا جس کے ترجمہ کے لئے میں اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ ارادہ کر چکا تھا۔ "جاوید نامہ" ایک ایسی داستان ہے جس میں اقبالؒ نے مسلمانوں کے بہت سے احوال کا تذکرہ کیا ہے اور سیاحتِ سیارات کے پیرایہ میں اپنے فلسفہ و افکار کی تشریح کی ہے اور اس سلسلہ میں مشہور صوفی شاعر جلال الدین رومیؒ "صاحبِ مثنوی" کو اپنا دلیل راہ بنایا ہے، اس لئے میں نے کسی پس و پیش کے بغیر "پیامِ مشرق" کے بعد "جاوید نامہ" کو ترجمہ کے لئے منتخب کر لیا۔

لیکن اقبالؒ کو پسند کرنے والے اور اس کے شیدائیوں میں سے ایک دوست نے جو نہ صرف اقبالؒ کے کلام اور اس کے فلسفہ و سیرت پر گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ ان مخصوص افراد میں سے ہیں جن کو اقبالؒ سے صحبتیں میسر رہی ہیں اور انہوں نے اقبالؒ کے تعارف اور اس کے پیغام کی توضیح و تشریح میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے، ایک دوسرے دیوان کے ترجمہ کی تجویز میرے سامنے رکھی۔

ہمارے دوست جناب غلام احمد پرویز نے فرمایا: میری رائے ہے کہ آپ "ضربِ کلیم" کا ترجمہ کریں جو اقبالؒ کا خود مرتب کردہ آخری دیوان ہے۔ اور "ارمغانِ حجاز" کے سوائے جو اقبالؒ کی وفات کے بعد شائع ہوا ہے، اس کی آخری منظومات میں سے ہے۔ اس لئے اس دیوان "ضربِ کلیم" میں اقبالؒ کا فلسفہ اور اس کے محکم افکار و نظریات پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اور ان خاص موضوعات میں جن کو اس نے دیوان کی فصول قرار دیا ہے، اس کا پیغام نہایت واضح ہے۔ "جاوید نامہ" ایک طویل، مسلسل اور دقیق نظم ہے جس کے سمجھنے کے لئے فلسفہ و تاریخ کے کثیر سرمایہ کی ضرورت ہے اور صرف ان لوگوں کے لئے اس کے مطالب کا سمجھنا آسان ہے جن کو علم و ادب سے بہرۂ وافر میسر آیا ہو۔ "جاوید نامہ" کا مترجم ترجمہ کی تکمیل سے قبل اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے برعکس "ضربِ کلیم" کا مترجم ہر قطعہ کا ترجمہ کر لینے کے بعد ایک نتیجہ خیز کام کی تکمیل کر لیتا ہے اور ایک فصل کو ختم کر کے ایک مرحلہ تک پہنچ جاتا ہے۔

ان تمام امور کے علاوہ "ضربِ کلیم" میں اشعار کی تعداد کم اور ترجمہ کی سہولت نسبتاً زیادہ ہے۔ محترم دوست پیہم اسی قسم کے دلائل پیش کرتے رہے یہاں تک کہ میں بھی ان کی رائے سے متفق ہو گیا کہ جاوید نامہ پر ضربِ کلیم کے ترجمہ کو ترجیح دوں اور اس داستان کو ایک بار پھر کسی دوسری فرصت کے لئے اٹھا رکھوں۔ اللہ مددگار ہے۔

ہماری رائے تھی کہ ترجمہ سے پہلے اس دیوان کے مطالعہ، تحقیقِ مطالب اور اس کی تعبیرات میں غور و فکر کے لئے ایک جگہ مجتمع ہوتے رہیں اس کے لئے طے پایا کہ اس قسم کے اجتماعات مصری سفارتخانہ کراچی کے قصر میں منعقد ہوں اور جب تک اس دیوان کے مطالعہ سے فراغت میسر آئے ہفتہ میں دو یا تین بار ہم جمع ہوتے رہیں۔

اس اندیشہ کے پیشِ نظر کہ مختلف مشغولیتیں ان مجالس میں سدِ راہ نہ ہوں۔ ہم نے اس امر کا اہتمام کیا کہ ایک

مجلس سے اس وقت تک نہ اٹھیں جبتک آئندہ نشست کے لئے کوئی وقت مقرر نہ کر لیا جائے۔ ان مجالس کا اشتیاق اور ان کی یاد ہمیں ان کی شرکت کے لئے زیادہ مستعد رکھتی تھی۔

میں، فاضل محترم غلام احمد پرویز اور محترم سید عبدالواحد (انسپکٹر جنرل جنگلات، حکومت پاکستان[1]) جو فلسفۂ اقبالؒ اور اس کی سیرت پر لکھنے والے مصنفین میں سے ہیں اس مجلس کے ارکان تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے اقبالؒ دوست، احباب بھی ان مجالس میں شریک ہوتے۔ بعض لوگ پابندی سے آتے اور بعض ایک دو مجلسوں میں ہی شرکت کر سکتے تھے۔ اس لئے یہ حلقہ کبھی تنگ اور کبھی وسیع ہوتا رہتا تھا۔

وقتاً فوقتاً ہم دعوتوں کا اہتمام بھی کرتے تھے اور ان میں مجلسِ اقبالؒ کے دوسرے ارکان اور اس کے صدر چودھری نذیر احمد کو بھی شرکت کی دعوت دیتے تھے جو اُس وقت پاکستان کے وزیر صنعت تھے۔

محترم غلام احمد پرویز شیخِ مجلس تھے۔ وہ کتاب پڑھتے، اس کی تشریح کرتے اور فکرِ اقبالؒ کی بحث و تفصیل میں کسی شعری و ادبی یا فلسفی موضوع کی انتہا تک پہنچ جاتے اور اس کے ساتھ ساتھ اقبالؒ کے کلام کو قرآنی حقائق سے مربوط کرتے جاتے۔

ان مجالس کو "مجلسِ اقبالؒ" یا "مجالسِ اقبالؒ" کا نام دیا گیا تھا۔ ان میں شرکت کرنے والے "درویشانِ اقبالؒ" اور "قلندرانِ اقبالؒ" کے نام سے موسوم کئے جاتے۔ اور غلام احمد پرویز صاحب "شیخِ درویشاں" اور "شیخ قلندرانِ اقبالؒ" تھے۔

عیدالفطر کے بعد ۱۳۷۱ھ میں ہم نے "ضربِ کلیم" کا مطالعہ شروع کیا اور جب اس سے فارغ ہوئے تو میں نے کتاب کے آخری صفحہ پر بطور یادداشت حسبِ ذیل کلمات لکھے:۔

شنبہ ۵ محرم ۱۳۷۱ھ (۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء) کی شب میں دیوان کا مطالعہ تکمیل کو پہنچا۔ اوّل و آخر خدا ہی کے لئے حمد و ستائش ہے۔ اللہ تعالیٰ روحِ اقبالؒ پر رحم فرمائے۔

تین ماہ میں کتاب ختم ہو گئی، اگرچہ اس دوران میں بعض اوقات مشاغل کی کثرت کی وجہ سے ہم مجلس کی طرف پوری توجہ نہ دے سکے اور ان کا سلسلہ ہمارے اندازے کے مطابق جاری نہ رہ سکا۔

شبِ دوشنبہ ۱۱ شوال ۱۳۷۰ھ (۱۶ تموز ۱۹۵۱ء) کو ضربِ کلیم کے ترجمہ کی ابتدا ہوئی۔ اور جب میں اس کے ترجمہ سے فارغ ہوا تو ان سطور کے نیچے جن میں مطالعہ کی تاریخ ثبت کی گئی تھی میں نے ذیل کے کلمات تحریر کئے۔

اللہ تعالیٰ نے شب یک شنبہ ۱۸ صفر الخیر ۱۳۷۱ھ (۱۸ تشرین ۲ - ۱۹۵۱ء) کو ترجمہ کی تکمیل کی توفیق الذالی فرمائی۔

اس طرح قریباً چار ماہ تک میں ترجمہ کے کام میں مشغول رہا اور مطالعہ کتاب کے ڈیڑھ ماہ بعد اس سے فراغت میسر آئی۔

(۰)

"پیامِ مشرق" کے ترجمہ میں طباعت کی صفائی اور دیدہ زیبی کے لحاظ سے جو فروگذاشتیں رہ گئی تھیں ان

---

[1] یہ اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

کی مکافات کی غرض سے اس دیوان کی طباعت کے لئے میں نے مصر کو ترجیح دی۔ چنانچہ سفرِ وطن کی تیاری شروع کی اور جب ۶؍ دسمبر کو وطنِ مالوف پہنچا تو سفرِ بہیم اور کثرتِ مشاغل کے دوران میں فرصت کے جو لمحات میسر آئے ان میں دیوان کی تبییض اور اس کو طباعت کے لئے تیار کرنے کا شغل جاری رکھا۔ فاضلِ عزیز محمود جعفر الجبالی (ٹیکس انسپکٹر حکومتِ مصر) نے ان مبیضات کو ٹائپ کرنے کی ذمہ داری لی۔

لجنۃ الازہر نے میرے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس دیوان کو وہ اپنے اہتمام سے شائع کریں، تاکہ یہ انہی کی مطبوعات میں شمار کیا جائے۔ میں نے شکر گذاری کے ساتھ ان کی یہ پیش کش قبول کر لی۔ میری خواہش تھی کہ اس کی طباعت میرے قیامِ وطن کے دوران میں مکمل ہو جائے۔ تاکہ میں خود اس کی تصحیح کی نگرانی کر سکوں اور ضرورت ہو تو بعض کلمات میں ترمیم و تبدیل کا فرض بھی انجام دوں۔ لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا اور کتاب کی طباعت سے قبل ہی مجھے پاکستان آنا پڑا۔

عزیزِ محترم جناب جبالی طباعت کی نگرانی اور پابندی کے ساتھ میرے پاس ہوائی ڈاک سے پروف بھیجتے رہنے کی ذمہ داری انجام دیتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

واقعی یہ ایک خوش نصیبی ہے کہ اس عظیم فلسفی شاعر۔ اقبالؒ۔ کی تمنا میرے ذریعہ بر آ رہی ہے اور اقبالؒ کے بعض دواوین میرے توسط سے عربی میں منتقل ہو کر قرآنی زبان کی ادبی دولت میں اضافہ کر رہے ہیں۔

یہ امر بھی میرے لئے باعثِ مسرت ہے کہ اسلام کے اس ممتاز شاعر کی چودھویں سالانہ یادگار کے موقعہ پر میں ضربِ کلیم کو عربی لباس میں پیش کر رہا ہوں۔ جیسا کہ اس سے قبل تیرھویں برسی کے موقع پر میں نے "پیامِ مشرق" کے ترجمہ کی پیش کش کی تھی۔

بارہا میں نے یہ آرزو کی تھی کہ اقبالؒ کے دواوین کا عربی میں ترجمہ کروں لیکن مجھے کبھی یہ امید نہیں تھی کہ توفیقِ الٰہی سے آٹھ ماہ سے کم مدت میں دو دیوانوں کے ترجمہ کی خدمت انجام دینا میرے لئے ممکن ہو سکے گا اور ایک ہی سال میں ان کی اشاعت کا مرحلہ طے ہو جائے گا۔

اس توفیقِ عظیم کے لئے اللہ ہی کا شکر و سپاس ہے اور اسی سے توفیق و الہام اور راستکاری کی التجا کی جا سکتی ہے۔ وھو حسبی و نعم الوکیل۔

عبدالوہاب عزام۔ کراچی

(۱۹؍ جمادی الثانی سنہ ۱۳۷۱ھ۔ ۱۰؍ فرار سنہ ۱۹۵۲ء)

(۰)

۲۔ تعارف

(ڈاکٹر عزام سے موصوف)

ضربِ کلیم اقبالؒ کا ایسا مجموعۂ کلام ہے جو انسان بحیثیت فرد، انسان بحیثیت رکن جماعت، دین، تربیت، ادب اور سیاست کے متعلق حکیمانہ افکار و نظریات پر مشتمل ہے۔ اس اعتبار سے یہ کلام شعریت کی نسبت فلسفہ اور تفکر میں زیادہ ڈوبا ہوا ہے لیکن جذبات اور تخیل کی آمیزش نے اس کو شعر کی صف میں شامل کر دیا ہے۔ کائنات کی مردہ

حقیقت شعر بن جاتی ہے جو انسان کے جذبہ و وجدان سے آب و رنگ حاصل کر لیتی ہے یا جس کو انسانی تخیّل ایک خاص شکل و صورت میں نمایاں کر دیتا ہے۔

شعریت ایک دائرہ ہے اور موضوعاتِ شعر اس دائرہ کے خطِ محیط سے مرکز تک مرتب اور منظم ہیں۔ بعض موضوعات خطِ محیط سے قریب تر ہیں۔ ان کو شعر سے کم اور ان موضوعات سے زیادہ قریبی ربط ہوتا ہے جو اس دائرے سے خارج ہوں۔ بعض موضوعات شعریت میں زیادہ عمیق ہوتے ہیں اور اس طرح جذبہ و تخیّل کے تناسب کے ساتھ یہ ترتیب مرکزی دائرہ کی خالص شعریت تک پہنچ جاتی ہے۔

ضربِ کلیم میں بعض اوقات اقبالؒ کا کلام شعر کی اس صنف میں جلوہ آرا ہوتا ہے جو مجرد حقائق سے قریب تر ہے اور بعض مرتبہ خالص شعریت میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی وہ مرکزِ شعر کی بہ نسبت خطِ محیط سے زیادہ قریب ہے۔

اس بناء پر پیامِ مشرق کی بہ نسبت مجھے ضربِ کلیم کے ترجمے میں زیادہ مشقت اور دشواری کا سامنا ہوا ہے۔ اس دشواری کی ایک خاص وجہ میری یہ زبردست خواہش بھی تھی کہ ترجمے میں شعری نزاکتیں پوری طرح محفوظ رہیں۔ اصل کا حسنِ شعر پھیکا نہ ہو جائے۔ اور وہ ہلکی سی رنگین شعری نقاب نہ اتر جائے جو اقبالؒ نے حقائقِ فلسفیہ کے چہرے پر ڈالی ہے۔ کہیں ایک چمن سے دوسرے چمن میں منتقل کرنے کی وجہ سے شعر کی یہ ننھی ننھی کلیاں مرجھا نہ جائیں۔

بحیثیتِ مجموعی یہ کلام نغمہ موسیقی نہیں بلکہ ایک ایسی ضربِ خارا شگاف ہے جو سینۂ سنگ سے چشمے پیدا کرتی ہے جیسا کہ خود اقبالؒ نے کہا ہے:-

یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

شاید پڑھنے والے اس کلام میں شاعرانہ انداز، تخیّل اور تازگیٔ فکر کی جستجو کی بجائے ان حقیقتوں کو زیادہ شفاف محسوس کریں گے جن کو پیرایۂ شعر میں ظاہر کیا گیا ہے اور شاید اس طرح وہ انشا پرداز اور مترجم کی ان دشواریوں کا بھی اندازہ لگا سکیں گے جو ایک سنجیدہ اور متین اسلوبِ شعر میں ان حقائق کی نقاب کشائی میں پیش آئی ہیں۔

ابواب و فصول

شاعرِ مشرق نے ضربِ کلیم کو چھ فصلوں پر تقسیم کیا ہے اور ان سے پہلے دو قطعے اور ایک قصیدہ پیش کیا ہے۔ پہلا قصیدہ ان چند ابیات پر مشتمل ہے جن میں دیوان کو نواب حمید اللہ خاں والیٔ بھوپال کے نام معنون کیا گیا ہے۔ دوسرے قطعے میں شاعر نے قارئین سے خطاب کیا ہے اور قصیدہ کو دیوان کی تمہید کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

دیوان کی فصول حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) اسلام اور مسلمان۔ (یہ اس دیوان کی سب سے طویل فصل ہے)

(۲) تعلیم و تربیت۔

(۳) عورت۔

(۴) فنونِ لطیفہ۔ (یہ دیوان کی دوسری طویل فصل ہے)

(۵) سیاستِ مشرق و مغرب۔

(۶) محرابِ گل افغان کے افکار۔

فلسفۂ اقبال

اس موقعے پر اقبالؒ کے فلسفے کے متعلق بھی چند مختصر کلمات پیش کرنا مناسب ہے جو اقبالؒ کے مقاصدِ عالیہ اور اس کا منتہائے نظر سمجھنے میں پڑھنے والوں کے لئے مددگار ثابت ہوں گے۔ اقبالؒ کے فلسفہ کی اساس وہ تصوّر ہے جس کو اس نے خودی سے تعبیر کیا ہے۔

اقبالؒ نے بہت سے اشعار میں اپنے اس مسلک کو واضح کیا ہے اور اس کے لئے ایک جداگانہ مثنوی بھی مخصوص کی ہے جس کا نام اسرارِ خودی ہے۔

فلسفۂ خودی کا ماحصل یہ ہے کہ

(ا) خودی جوہرِ کائنات ہے، نظامِ کائنات کی بنیاد اور اس کا سرِّ حیات ہے۔

(ب) حیات، خودی مقاصد اور امنگوں کی تخلیق پر مبنی ہے۔

(ج) عشق، آرزو، سعیِ پیہم، بیباک عمل اور خطر پسندی سے خودی کو فروغ میسر آتا ہے۔

(د) جہادِ مفصّل اور جہدِ پیہم سے زندگی قوت و نمو اور فروغ پاتی ہے اور جھجک، تردّد، آسائش طلبی اور پستیوں پر قناعت سے شعلۂ حیات افسردہ ہو جاتا ہے۔

انسان کے لئے یہ ضروری ہے کہ خود اعتماد ہو، فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور اپنے قول و فعل میں خودی کو نمایاں کرے۔ تقلید، غیر پر اعتماد اور دوسروں کے سامنے دست طلب بڑھانے سے اجتناب کرے اور ان قوتوں سے غافل نہ ہو جو اس کی ذات میں ودیعت کی گئی ہیں۔

ان چیزوں سے خودی محکم ہوتی ہے اور خودی کا استحکام ہی اس زندگی کا مقصد ہے ــــ شاعرِ مشرق اشیاء کی حسّی اور معنوی قوتوں کا دلدادہ ہے اور اسی لئے وہ جرمن فلسفی نیٹشے کو پسند کرتا ہے لیکن اس پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ نیٹشے صرف جسم کا ادراک کر سکا اور عرفانِ روح سے بے بہرہ رہا۔ اس کی دسترس محض علم و عقل تک ہے، قلب و عشق تک اس کو رسائی حاصل نہ ہو سکی اور اسی لئے اقبالؒ کہتا ہے کہ وہ نکتۂ توحید کا اہل نہ تھا۔

حریفِ نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم — نگاہ چاہیئے اسرارِ لا الٰہ کے لئے

اقبالؒ کے نزدیک قوت و قدرت عناصرِ جمال ہیں۔ جلال کے بغیر کمالِ جمال ناممکن ہے۔ جلال اور جمال کے عنوان سے ایک قطعہ میں وہ کہتا ہے:۔

میری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی — کہ سربسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک
نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر — نہ انفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک!

بلکہ وہ کہتا ہے کہ افسردہ و مضمحل شعلے عذاب کے لئے بھی موزوں نہیں ہیں۔

مجھے سزا کے لئے بھی نہیں قبول وہ آگ — کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

اقبالؒ کے نزدیک حسن و قبح اور خیر و شر خودی کی پستی و بلندی کے تابع ہیں۔

نمود جس کی فراز خودی سے ہو وہ جمیل — جو ہو نشیب میں پیدا، قبیح و نامحبوب

پختہ اور محکم خودی کی انفرادیت جماعت میں منسلک ہونے کے باوجود فنا نہیں ہوتی۔ "رموزِ بے خودی" میں اقبالؒ نے واضح کیا ہے کہ ایک فردِ قوی کس طرح جماعت سے وابستہ رہ کر استفادہ کرتا ہے اور اس وابستگی کے باوجود اس کا انفرادی تشخص کس طرح برقرار رہتا ہے۔ ضربِ کلیم میں وہ مردِ بزرگ کے عنوان سے ایک قطعے میں کہتا ہے:

شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

انسان کائنات کی عظیم ترین حقیقت ہے اور کائنات کی ہر چیز اس کے تابعِ فرمان ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے:۔

ولقد کرمنا بنی آدم وحملنٰھم فی البر والبحر ورزقنٰھم من الطیبٰت وفضلنٰھم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلا۔

وسخرلکم ما فی الارض جمیعا۔

وسخرلکم الانھار و سخرلکم الشمس والقمر دائبین و سخرلکم اللیل والنھار و اتاکم من کل ما سالتموہ وان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا۔

انسان مجبور و بے اختیار نہیں بلکہ آزاد و خود مختار ہے۔ اس کا عزم نشانِ تقدیر ہے یا آثارِ قضا پر جاری ہے۔ ایک مومن آزاد اس دنیا میں بلکہ دنیا و آخرت میں صلاح و فساد اور بقاء و فنا کا معیار ہے۔

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے ۔۔۔ دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

نباتات و جمادات قانونِ طبیعت کے محکوم ہیں لیکن مردِ مومن اپنے پروردگار کے احکام کی اطاعت اور فرمانبرداری کے سوا کسی چیز کا پابند نہیں ہے۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات ۔۔۔ مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

تہذیبِ جدید

اقبالؒ کہتا ہے یورپین تہذیب محض مادی ہے جس میں نہ قلب ہے نہ روح۔ اقبالؒ نے اس تہذیب پر شدید نکتہ چینی کی ہے۔ وہ اس مادی تہذیب کے فلسفہ کا تذکرہ کرتا ہے لیکن ان کے بیشتر نظریات کو رد کر دیتا ہے وہ صرف اسلام اور اس کی تہذیب میں بشریت کی فلاح دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اسلامی تہذیب ہی نوعِ انسانی کے باہمی ربط و ائتلاف کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اور اس کو برادرانہ انس و تعاون کے ساتھ شاہراہِ حق پر مجتمع کر سکتی ہے۔

اقبالؒ کا فلسفہ ضربِ کلیم میں

خودی اور عناصرِ خودی کے متعلق اقبالؒ کا فلسفہ۔ اسلامی اور یورپی تہذیب کے متعلق اس کے نظریات اور ان کے علاوہ اس کے دوسرے حکیمانہ افکار و آراء، یہاں تک کہ ادب اور فنونِ لطیفہ کے متعلق اس کے زاویۂ نگاہ ضربِ کلیم کی تقریباً ہر فصل میں جھلکتے ہیں۔

اقبالؒ کے نزدیک وہ موسیقی حرام ہے جس سے روح میں ضعف و اضمحلال پیدا ہوتا ہو۔

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام ۔۔۔ حرام میری نگاہوں میں نائے چنگ و رباب

مصور کے لئے ضروری ہے کہ زندگی کی عکاسی کرے اور فطرت کی محاکات کرتے ہوئے آثارِ طبیعت میں اپنا نقشِ خودی نمایاں کرے

فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے آئینہ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

فقر

ضرب کلیم اور دوسرے دیوانوں میں بہت سے مواقع پر اقبالؒ نے فقر پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا ہے۔ وہ فقر کو کلید خیر و سعادت اور سربلندی کا وسیلہ قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک فقر خطرات میں بے باکانہ کود پڑنے کا محرک ہے۔

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روح قرآنی

اس کا دعویٰ ہے:

خوار جہان میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم عشق ہو جس کا جسور فقر ہو جس کا غیور

وہ کہتا ہے:

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلب سلیم
اس کی بڑھتی ہوئی بیباکی و بیتابی سے تازہ ہر عہد میں ہے قصہ فرعون و کلیم

اور اس لئے اس کی تمنا ہے کہ

اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار

اقبالؒ کے کلام میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک فقر بے زری یا مال کی کمی کا نام نہیں۔ نہ وہ احتیاج معاش اور اس متاع دنیوی کی حاجتمندی کا نام ہے جس کو انسان اپنے لئے باعث عزت سمجھتا ہے۔ بلکہ فقر سے اس کی مراد یہ ہے کہ نفس ہوس ملک اور حرص و طمع کی قید سے آزاد رہ کر عمل کی طرف اس طرح پیش قدمی کرتا رہے کہ کوئی کامیابی اس میں سرکشی اور کوئی محرومی اس میں پستی پیدا نہ کر سکے۔ بسا اوقات فقیر سیم و زر کے انبار کا بھی مالک ہو سکتا ہے اور اکثر مرتبہ صاحب سطوت بادشاہ بھی۔ لیکن مال و متاع کسی وقت بھی اس کی سطوت و جبروت کو درماندہ نہیں کر سکتے۔

فقر کا یہ مفہوم بعض صوفیا کی تشریح سے مختلف نہیں ہے۔

قشیری نے اپنے رسالے میں یحییٰ ابن معاذ کا قول نقل کیا ہے کہ

فقر کی حقیقت یہ ہے کہ خدا کے سوا ہر چیز سے بے نیازی ہو۔

شبلی کا بیان ہے کہ

فقر کی ادنیٰ ترین علامت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمام دنیا کا مالک ہو کر اس کو ایک ہی دن میں خرچ کر ڈالے اور پھر اس کے قلب میں یہ خطرہ گذر جائے کہ اس میں سے صرف ایک دن کی روزی روک لینا تو اس کا فقر صادق نہیں ہے۔

رسالہ قشیریہ میں ایک دوسرے موقعے پر کہا گیا ہے:۔

صحت فقر کا معیار یہ ہے کہ اس ذات کے سوا جس کی طرف فقیر کی احتیاج ہے کسی چیز کے حصول سے استغناء میسر نہ آئے۔

سہروردی نے عوارف المعارف میں کتانی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ

جب فقرالی اللہ درست ہو جاتا ہے تو غناعنی باللہ میسر آتا ہے یہ دونوں احوال ہیں اور ایک کی دوسرے کے بغیر تکمیل نہیں ہوتی۔

ان بیانات سے واضح ہے کہ فقر ملک و مال کے فقدان کا نام نہیں۔ اس کی حقیقت صرف یہ ہے کہ انسان ان چیزوں سے وابستہ نہ ہو جن کو وہ پالیتا ہے یا کھو دیتا ہے۔ یعنی یہ کہ دنیا اس کے دل میں بسی ہوئی نہ ہو خواہ اس کے ہاتھوں میں کھیلتی ہو۔

اقبالؒ کہتا ہے :-

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈھ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شانِ بے نیازی
یہ فقرِ غیور جس نے پایا — بے تیغ و سنان ہے مردِ غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری — اللہ سے مانگ یہ فقیری!

—(o)—

(۳) پیش لفظ

(محترم پرویز صاحب)

جس کتاب کا ترجمہ آپ کے پیشِ نظر ہے، علامہ اقبالؒ نے اس کا نام ضربِ کلیم رکھا اور خود ہی اس کی تشریح ان الفاظ سے کردی۔

(اعلانِ جنگ عصرِ حاضر کے خلاف)

میرے نزدیک یہ الفاظ علامہ اقبالؒ کی صرف ایک کتاب، ضربِ کلیم ہی کے شارح نہیں بلکہ ان کے پورے کے پورے پیغام کے ایک عظیم حصے کے مفسر ہیں۔ اگر حضرت علامہؒ کے پورے پیغام کا تجزیہ کیا جائے تو وہ دو اہم حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حصہ نفیرِ انقلاب ہے اس "غیر منزل من اللہ" اسلام کے خلاف، جسے عجمی سازش نے نہایت سادگی اور پرکاری سے وضع کیا اور دوام ہمرنگ زمین کی صورت میں، عین اسلام بنا کر اس امت پر مسلط کر دیا جو ان غیر قرآنی تصورات کو مٹانے کے لئے مبعوث ہوئی تھی۔ عجم کی یہ سازش درحقیقت انتقام تھی، یہود و نصاریٰ و مجوس کی ان شکستوں کا جو انہیں میدانِ جنگ میں مسلمانوں کی تیغِ حق کے مقابلے میں اٹھانی پڑیں۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ اس ملتِ مجاہدین کی قوت و سطوت کا راز قرآن کی حیات بخش تعلیم میں ہے۔ لہٰذا انہوں نے ایسی چال چلی کہ مسلمانوں کو قرآن سے یکسر بیگانہ بنا کر، غیر قرآنی اسلام کے فریب میں اُلجھا دیا۔ اور یہ کچھ اس کامیاب طریق سے کیا کہ سادہ لوح مسلم اس سراب رنگ و بو کو سچ مچ کا گلستان سمجھنے لگ گیا۔ یونان کا خواب آور فلسفہ، حشیشیئن۔ مجوس کی غلامانہ نسل پرستی۔ یہود کی قشری شریعتِ رسومات۔ رہبانِ نصاریٰ کی مرگ آفریں خانقاہیت، ایک ایک کر کے اسلام کے لاینفک اجزاء بن گئے اور اس طرح یہ ملت جو کبھی ذوقِ عمل سے شعلہ جوالہ تھی، کوتاہی عمل سے راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ اقبالؒ کے پیغام کا ایک حصہ اسی "غیر منزل من اللہ" اسلام کے لئے پیامِ مرگ اور قرآنی اسلام کے احیاءُ

کے لئے تشدیدِ حیات تھا۔

علامہ اقبالؒ کے پیغام کا دوسرا حصہ اس فتنے کے خلاف احتجاج مسلسل تھا جو تہذیبِ مغرب کے رنگ میں، طوفان درطوفان امنڈ سے چلا آرہا تھا اور جس کی تموج انگیز طغیانیاں ملت اسلامیہ کی نژادِ نو کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لئے جارہی تھیں۔ ضربِ کلیم اس تہذیبِ عصرِ حاضر کے جنود و عساکر کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔

سوال یہ ہے کہ تہذیبِ حاضر کہتے کسے ہیں اور اقبالؒ نے اس کی اس قدر مخالفت کیوں کی؟ اس سوال کا جواب سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک پہلے یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ اسلامی تہذیب کیا ہے۔

جس شخص کے سامنے قرآن کے اوراق کھلے ہیں اس پر یہ حقیقت روشن ہے کہ اسلام ایک ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی ہے جسے الدین کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن نے انسانی زندگی کے لئے ایک نصب العین مقرر کر دیا ہے اور اس کے ساتھ وہ حدود متعین کر دی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے انسان اپنے اختیارات کا استعمال کر سکتا ہے۔ یہ نصب العین اور حدود دونوں غیر متبدل ہیں۔ انہی کو ابدی صداقتیں یا مستقل اقدارِ زندگی کہا جاتا ہے۔

قرآن کی رو سے اگرچہ حیات کی نمود مختلف پیکروں میں ہوتی ہے، حیات کا سرچشمہ ایک ہے۔ اور یہی سرچشمہ ان ابدی صداقتوں کی اصل ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ سرچشمۂ حیات اور ابدی صداقتوں کے سرچشمہ کی وحدت کے عقیدے سے فطری طور پر یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ

(ا) ہر انسان من حیث الانسان زندگی کی ممکنات اپنی ذات میں مضمر رکھتا ہے جن کی نشو و نما اور نمودِ زندگی کا مقصود ہے۔ ان جواہرِ مضمر کی پختگی اور تابندگی سے انسان میں شانِ انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا تحفظ بقا اور تسلسل (بعد از ممات) انسانی جد و جہد کا ماحصل ہے۔

(ب) تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں جو جغرافیائی، لسانی، نسلی، اور وطنی حدود سے متاثر نہیں ہوتی۔

(ج) تمام نوعِ انسانی کی فلاح کا راز ایک ہی ضابطۂ زندگی کے مطابق زندگی بسر کرنے میں ہے جو وحی کے ذریعے مل سکتا ہے اور جو آج، اس آسمان کے نیچے، قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔

ان محکم اصولوں کی بنیاد پر اسلام ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں نوعِ انسانی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتی، شرفِ انسانیت کے سدرۃ المنتہیٰ تک جا پہنچے۔ اس معاشرے کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

(۱) اس میں افرادِ معاشرہ اپنے اندر ان صفاتِ خداوندی کو منعکس کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں جنہیں قرآن اسماء الحسنیٰ سے تعبیر کرتا ہے اور جو کائنات میں مستقل اقدار کا سرچشمہ ہیں۔

(۲) ان افراد میں ایسا ضبط پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ ان صفات میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ استمرار کے لئے حسن کی شرط ضروری ہے اور حسن نام ہے تناسب کے اعتدال کا۔

(۳) ان افراد کی نگاہوں میں ایسی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ صحیح صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فلاں خارجی حادثہ کی صورت میں فلاں قسم کی صفتِ خداوندی کا ظہور ہونا چاہیئے۔

(۴) ان افراد پر مشتمل جماعت میں اشیائے فطرت کی تسخیر کی قوت اور ان کے ماحصل کو فلاحِ انسانیت کے لئے صرف کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۵) وحدتِ خالق، وحدتِ انسانیت اور وحدت و ائتلافِ ملت کے محکم تصور سے انسان اور کائنات۔ انسان اور انسان۔ اور خود انسان کے اپنی ذات کے تضادات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے جس سے انسانی معاشرہ کی ناہمواریاں مٹتی چلی جاتی ہیں۔

(۶) اس جماعت کا ہر فرد اپنے آپ کو خدا کی صفتِ رب العالمینی کا مظہر سمجھتے ہوئے بلا مزد و معاوضہ انسانیت کی ربوبیت کا کفیل بن جاتا ہے۔ اس طرح تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بھی ازخود پوری ہوتی جاتی ہیں اور ان کی فطری صلاحیتوں کے کامل نشوونما کے وسائل و اسباب بھی یکساں طور پر میسّر آتے جاتے ہیں۔ اور یوں زندگی کی جوئے رواں، ہنستی، کھیلتی، رقص کرتی، شاداں و فرحاں، اقطار السمٰوٰت والارض سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں قرآنی تہذیب کا ماحصل۔ اس کے برعکس تہذیبِ عصرِ حاضر اس تصور کی یکسر نقیض ہے۔ اس تہذیب کی اساس یہ فلسفہ ہے کہ مادی عناصر کے محض اتفاقیہ طور پر یکجا ہو جانے سے حیات وجود میں آگئی اور ان عناصر کے منتشر ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ دنیا یہی مادی عناصر کی دنیا ہے جس میں ہر شے تغیّر پذیر ہے۔ لہٰذا دنیا میں نہ کوئی مستقل اقدار ہیں نہ قانونِ مکافاتِ عمل۔ خیر وہ ہے جس سے کسی فرد یا افراد کے گروہ، قوم، کو ذاتی فائدہ حاصل ہو جائے۔ (خواہ اس سے دوسرے افراد یا دوسری اقوام کی رگِ حیات ہی کیوں نہ کٹ جائے) اور شر وہ ہے جس سے کسی فرد یا قوم کا ذاتی نقصان ہو۔ ہر فرد یا قوم کا نصب العین حیاتِ منفعتِ خویش کا حصول ہے اور علم و عقل کا کام یہ ہے کہ وہ اس منفعت کے حصول کے لئے اسباب و تدابیر اور حیل و مکائد فراہم کرے۔ اس فلسفۂ حیات (یا تہذیبِ عصرِ حاضر) کا نتیجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر خود اہلِ مغرب کی تحقیق کے مطابق، وہاں کی آبادی کا ہر چھٹا فرد ایسا ہے جسے عمر کا کچھ نہ کچھ حصّہ پاگل خانے میں گذارنا ہوگا۔ اور اجتماعی طور پر یہ عالم ہے کہ دنیا کی مختلف قومیں یا تو باہمی کشت و خون کے لئے مصروفِ پیکار رہتی ہیں یا اس کشت و خون کی تیاری میں مشغول۔

اقبالؒ نے اقوامِ مغرب کے فلسفۂ حیات اور نظریۂ سیاست و عمرانیت کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا جس سے اس پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ یہ فلسفۂ حیات اور منہاجِ زندگی دنیا میں جہنّم پیدا کر دینے کا موجب ہے۔ دوسری طرف قرآنی بصیرت نے اس پر حقائقِ زندگی کو اس طرح واشگاف کر دیا کہ وہ بادلوں میں چھپی ہوئی بجلیوں اور ہواؤں میں مستور طوفانوں کو بے حجاب اپنے سامنے دیکھ لیتا تھا۔ یہی تھی وہ قرآنی بصیرت جس کی بنا پر اس نے ۱۹۰۷ء میں، اقوامِ مغرب کو للکار کر کہہ دیا تھا کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اُس وقت سے لے کر اپنی زندگی کے آخری لمحات تک، اقبالؒ اقوامِ مغرب کو بالعموم اور ملّتِ اسلامیہ کو بالخصوص

اس اہرمنی تہذیب کے نتائج و عواقب سے آگاہ کرتا رہا۔ اس مجموعۂ انذار و تنذیر کا نام ہے، ضربِ کلیم جس سے اقبالؒ بتکدۂ عصرِ حاضر کے تمام بتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے۔ لیکن وہ اپنے عصائے کلیمی سے صرف فرعونیت، ہامانیت اور قارونیت ہی کے نگاہ فریب سحر کو نہیں توڑتا بلکہ وہ اس کے بعد اپنی قوم کو قندیلِ قرآنی کی روشنی میں، فاران و سینا کی ان محفوظ و بابرکت وادیوں میں لے جاتا ہے جہاں زمین سے فوز و فلاح کے چشمے ابلتے اور آسمان سے رشد و سعادت کے من و سلویٰ اترتے ہیں۔

پیامِ اقبالؒ کی خوش بختی ہے کہ وہ، رفیقِ محترم، صاحب السعادۃ، عبدالوہاب عزام بے کی "خارہ شگافی اور جوئے شیر آوری" کے تصدق، تنگنائے اُردو سے نکل کر بحیرۂ عرب میں بادبان کشا ہوتا ہے، اور اس طرح اپنی اس افادیت کو جو اس وقت تک "شرمندۂ ساحل" تھی بیکراں بنا رہا ہے۔

اور خوش بختی ہے خود عربی بولنے والی ملّتِ اسلامیہ کی جو اس پیامِ حیات بخش سے، جو معنوی لحاظ سے ان سے اس قدر قریب ہونے کے باوجود لفظی اعتبار سے ان سے اتنا دور تھا، شرفِ تعارف حاصل کر رہی ہے۔

خدا کرے یہ پیامِ انقلاب سرزمینِ عرب کے لئے پھر وہ تخمِ صالحہ بن جائے جس سے ایک مرتبہ پہلے وہ شجرِ بلند و بالا پیدا ہو چکا ہے جس کی رفعتوں کے متعلق اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء کہا گیا تھا۔ اور جس کی ہمہ گیر پہنائیوں کو لا شرقیۃ ولا غربیۃ سے تعبیر کیا گیا تھا۔

اس شجرِ طیب و مبارک کی روئیدگی دوبارہ آوری صرف قرآنی ماحول میں ممکن ہے۔ اور یہی پیامِ اقبال کا مقصود و منطوق ہے ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

(۰)

یہاں تک تو ضربِ کلیم کے متعلق ہوا۔ اقبالؒ کے عمومی مطالعہ کے ضمن میں ایک چیز ایسی ہے جسے مدِّ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اقبالؒ کی شاعری میں عربی اور فارسی لغت کے اکثر الفاظ ایسے ہیں جنہیں وہ ان کے لغوی معنوں میں استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ وہ کلامِ اقبالؒ کی خاص اصطلاحات ہیں جبتک ان الفاظ کے اصطلاحی معنے سمجھ میں نہ آئیں اقبالؒ کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آسکتا۔ مثلاً علم و عشق، عقل و دل، ذکر و فکر، خبر و نظر، سوز و ساز، یا درویش، قلندر، مردِ حر وغیرہ الفاظ اسی قبیل کے ہیں۔ یہ تمام اصطلاحات اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن وہ اصطلاح جو فکرِ اقبالؒ میں محور کا حکم رکھتی ہے اور جس کے گرد اس کا سارا کلام گردش کرتا ہے، خودی ہے۔ اقبالؒ سے پہلے یہ لفظ ہمارے ہاں غرور و تکبر کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ لیکن اقبالؒ نے اسے بالکل جداگانہ معنے پہنا دیئے اور یہ مفہوم اب اس درجہ رائج ہو چکا ہے کہ اس لفظ کے قدیمی معنی نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔

"خودی سے اقبالؒ کا مفہوم کیا ہے؟" اس سوال کا جواب مختصر الفاظ میں دینا آسان نہیں۔ اس لئے کہ اقبالؒ کا فلسفہ

درحقیقت فلسفۂ خودی ہے۔ اور جبتک اقبالؒ کا پورا فلسفہ سامنے نہ آجائے اس اصطلاح کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس تفصیل واطناب کا یہ موقع نہیں۔ لیکن چونکہ ضربِ کلیم میں بھی یہ لفظ بار بار سامنے آئیگا اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قلیل ترین الفاظ میں اس اصطلاح کا طائرانہ سا تعارف کرا دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ کیا انسان کی انفرادیت، شخصیت یا انا کوئی مستقل حقیقت ہے یا محض فریبِ تخیل"۔ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے مفکرین نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش نہ کی ہو۔ افلاطون اور اس کے اتباع میں حکمائے ایران اور ہند اس نتیجہ پر پہنچے کہ کائنات میں صرف حیاتِ کلی کا وجود ہے۔ اس لئے انسانی ذات (انا، یا شخصیت) محض فریب ہے۔ یہ فریب، عمل کے زور پر قائم رہتا ہے، اور عمل کی بنیاد آرزو پر ہے۔ لہٰذا اس فریب سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ انسان ترکِ آرزو سے ترکِ عمل کرلے، اور اس طرح انسانی ذات کا حباب ٹوٹ کر حیاتِ کلی کے بحر میں گم ہو جائے۔ اس (فنائے ذات) کا نام نجات ہے اور یہی زندگی کا مقصود ہے۔ یہی وہ فلسفۂ حیات تھا جو ہمارے ہاں نظریۂ وحدت الوجود کے نام سے رائج ہوا اور جس نے مسلمانوں جیسی ہمہ تن عمل قوم کو خاک کے آغوش میں سلا دیا۔

اقبالؒ نے اس فلسفۂ حیات کے خلاف مسلسل احتجاج کیا۔ اور اس کے برعکس فلسفۂ خودی پیش کیا۔ اس فلسفہ کا ملخص یہ ہے کہ حیات عالمگیر یا کلی نہیں بلکہ انفرادی ہے۔ حتیٰ کہ خدا بھی ایک فرد ہے اگرچہ وہ اپنی انفرادیت میں یگانہ اور نادر ہے۔ اس انفرادی زندگی کی اعلیٰ ترین صورت کا نام خودی ہے جس سے انسان کی شخصیت یا انفرادیت متشکل ہوتی ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی کا مقصود سلبِ ذات نہیں، اثباتِ خودی ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک، جوں جوں انسان، اس فردِ کامل و نادر کی مانند ہوتا جاتا ہے، (جسے انائے مطلق یا خدا کہتے ہیں) وہ خود بھی منفرد یا نادر ہو جاتا ہے۔ اس کا نام استحکامِ خودی ہے۔ "خدا کی مانند" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو منعکس کرتا جائے۔ خودی کے ضعف اور استحکام کے پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ انسان اپنی راہ میں آنے والے موانعات پر کس حد تک غالب آتا ہے۔ زندگی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مادہ شر ہے، اور اس لئے قابلِ نفرت۔ مادہ شر نہیں بلکہ یہ زندگی کی خوابیدہ قوتوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہے۔ جب انسانی خودی، موانعات پر غلبہ حاصل کرنے سے پختہ ہو جاتی ہے تو پھر موت کا جھٹکا بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس طرح انسانی زندگی دوام سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ بنا بریں ہر وہ عمل جس سے خودی میں استحکام پیدا ہو، خیر ہے۔ اور ہر وہ کام جس سے خودی کمزور ہو جائے، شر ہے۔

اقبالؒ کے نزدیک ارتقائے خودی کا پہلا مرحلہ، تخلیقِ مقاصد یا تولیدِ آرزو ہے۔ آرزو عینِ حیات اور اصل قوت ہے۔ کیونکہ یہی عمل کی محرک ہوتی ہے۔

تخلیقِ مقاصد کے بعد ——— دوسرا مرحلہ حصولِ مقاصد کے لئے جہدِ مسلسل ہے۔ حصولِ مقصد کے لئے اسی تپش و خلش کا نام اقبالؒ کی اصطلاح میں عشق ہے۔ اس جدوجہد کی کامیابی کے لئے تین شرائط ناگزیر ہیں۔ اوّل: اطاعت، اطاعت سے مراد ہے قوانینِ خداوندی (قرآن) کا کامل اتباع جس کے لئے قرآنی

معاشرہ کی تشکیل ضروری ہے۔ اس اطاعت سے انسان کے اندر ضبطِ نفس پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ دوسری شرط ہے۔ ضبطِ نفس سے مراد خواہشات کا دباؤ نہیں بلکہ امالہ یا کظامت (زائد قوتوں کا رخ دوسری طرف بدل دینے) سے ان میں توازن پیدا کرنا ہے۔ اس توازن کی اکمل ترین شکل ذاتِ خداوندی ہے جس میں متضاد صفات کا باہمی توازن اپنی انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔

اس تطہیرِ فکر و عمل اور تہذیبِ نفس سے انسان اس مقام تک جا پہنچتا ہے جسے اقبالؒ نیابتِ الٰہیہ سے تعبیر کرتا ہے اور یہ تیسری شرط ہے۔ نیابتِ خداوندی سے اقبالؒ کا مفہوم وہ قوتِ مجسّمہ ہے جو دنیا میں قوانینِ خداوندی (ضابطہ قرآنی) کی تنفیذ و ترویج کا موجب بنتی ہے۔ (نیابتِ الٰہیہ سے یہ مراد نہیں ہے کہ انسان، خدا کا قائم مقام یا جانشین بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ جانشینی صرف اس کی ہوتی ہے جو خود موجود نہ ہو) یہ مقام مومن ہے اور یہی مقام اقبالؒ کے نزدیک استحکامِ خودی کا آخری نقطہ ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان ساری دنیا پر غالب آجاتا ہے۔ دنیا اس پر غالب نہیں ہوتی۔ اس کیفیت کا نام اقبالؒ کی اصطلاح میں فقر، درویشی یا قلندری ہے۔ سب کچھ مسخر کر لینے کے بعد وہ استغنا جو اللہ کی صفتِ صمدیت اور "غنی" عن العالمین کا مظہر ہو۔ ان افراد پر مشتمل جماعت کا نام، امتِ مسلمہ ہے اور اسی جماعت کی نشاۃِ ثانیہ، پیامِ اقبالؒ کا منتہیٰ و مقصود۔ وہ اُمت جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ ؎

میانِ اُمتاں والا مقام است ۔۔۔ کہ آں اُمت دو گیتی را امام است!
نیاساید ز کارِ آفرینش! ۔۔۔ کہ خواب و خستگی بر وے حرام است

اور

بہ باغاں عندلیبے خوش صفیرے ۔۔۔ براغاں جرّہ بازے تیز گیرے
امیرِ او بسلطانی فقیرے ۔۔۔ فقیرے او بہ درویشی امیرے

لتکونوا شھدآء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیداً۔

پرویزؔ

اسے یاد رکھیئے!

(۱) منی آرڈر فارم کے نیچے اور اس کی پشت پر آپ اپنا نام اور پورا پتہ، ضرور لکھیئے اور اس طرح لکھیئے کہ وہ آسانی سے پڑھا جا سکے۔ اس سے ہمیں حساب رکھنے میں آسانی ہو گی اور آپ کے حساب میں کوئی الجھن پیدا نہیں ہو گی۔

(۲) کسی ماہ کا پرچہ نہ ملنے پر، سارا غصہ ادارہ طلوعِ اسلام پر نہ نکالا کریں۔ آپ کے اور ادارہ کے درمیان ایک اور کڑی بھی ہے۔ اور وہ ہے ڈاک خانے کا نظام۔ یہاں سے ہر پرچہ چیک کر کے انتہائی احتیاط سے بھیجا جاتا ہے۔ ادارہ اتنا ہی کر سکتا ہے۔ متعلقہ ماہ کی پندرہ تاریخ تک پرچہ نہ ملے تو ادارہ کی طرف اطلاع دیدیں۔ پرچہ (بشرطِ موجودگی) آپ کو بھیج دیا جائے گا۔ شکریہ

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (۲۴ دسمبر ۱۹۸۱ء تا ۱۸ مارچ ۱۹۸۲ء)

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم	روپے	
۱۔ محترمہ مسز ظفر سعید صاحبہ۔ سیالکوٹ	۳۰۰/-	۴۰۲۶/ ۱۴۲
۲۔ " مسز زبیدہ مشرف صاحبہ۔ اسلام آباد	۱۰۰/-	۴۰۲۷
۳۔ مرزا علی احمد بیگ صاحب۔ لاہور	۵۰۰/-	۴۰۲۸
۴۔ ملک محمد انور صاحب۔ چک ۱۹۲ ر ب	۵۰۰/-	۴۰۲۹
۵۔ فہیم الرحمان صاحب۔ میرپور ماتھیلو ضلع سکھر	۱۵۰۰/-	۴۰۳۰
۶۔ محترمہ مسز ظفر سعید صاحبہ۔ سیالکوٹ	۳۰۰/-	۴۰۳۱
۷۔ چوہدری فضل داد صاحب پنشنر معرفت بزم طلوع اسلام گجرات	۲۰/-	۴۰۳۲
۸۔ محترمہ مسز زبیدہ مشرف صاحبہ۔ اسلام آباد	۱۰۰/-	۴۰۳۳
۹۔ رانا محمد فضل الرحمان صاحب۔ فیصل آباد	۶۴/-	۴۰۳۴
۱۰۔ ملک محمد حنیف صاحب وجدانی جنبل سیداں۔ مری	۵۰/-	۴۰۳۵
۱۱۔ محمد ارشاد صاحب ٹیچر۔ چاران۔ مری	۲۵/-	۴۰۳۶
محترم	روپے	
۱۲۔ محترمہ مسز زبیدہ مشرف صاحبہ۔ اسلام آباد	۱۰۰/-	۴۰۳۷
۱۳۔ " مسز ظفر سعید صاحبہ۔ سیالکوٹ	۳۰۰/-	۴۰۳۸
۱۴۔ چغتائی میوزیم ٹرسٹ۔ گارڈن ٹاؤن لاہور	۱۰۰۰/-	۴۰۳۹
۱۵۔ قربان حسین صاحب۔ CLEVELAND یو کے	۱۰۴۳/-	۴۰۴۰
۱۶۔ چوہدری علی شیر چشتی (ڈپٹی پوسٹ ماسٹر ریٹائرڈ) برائے زوجہ مرحومہ رحمت بی بی۔ بہاولپور	۷۰/-	۴۰۴۱
۱۷۔ کریم بخش صاحب ریٹائرڈ مدرس چک نمبر ۲/۲۶ ایل اوکاڑہ چھاؤنی	۲۰۰/-	۴۰۴۲
میزان	۶،۱۷۳/-	
سابقہ میزان	۴،۳۳،۲۵۵/۳۳	
	۴،۳۹،۴۲۸/۳۳	

ایک اور کوہکن چل بسا!

طلوع اسلام کی سب سے پہلی بزم، مردان میں قائم ہوئی تھی۔ سرحد جیسی سنگلاخ زمین سے قرآنی جوئے شیر کا لانا، بڑی کوہکنی اور خارہ شگافی کا کام تھا۔ لیکن ان فرہادوں نے ہمت شکن مخالفتوں کے باوجود اپنے جہاد کو جاری رکھا، اور یہ جو آپ آج ان وادیوں میں کتاب اللہ کی آواز گونجتی سنتے ہیں یہ انہی کی استقامت کا نتیجہ ہے۔۔۔ افسوس ہے کہ اس قافلہ کے باہمت افراد ایک ایک کر کے ہم سے جدا ہوتے گئے۔ اور اب، بزم کے نمائندہ محترم عبداللطیف صاحب نے یہ جانکاہ اطلاع دی ہے کہ اِن اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کی آخری نشانی محترم محمود علی، پروپرائیٹر صدیقیہ انجینئرنگ ورکس (مردان) بھی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ مرحوم اپنی رہائش گاہ پر درسِ قرآن کریم (بذریعہ ٹیپ) کا باقاعدہ اہتمام فرماتے تھے، ان کی وفات سے تحریکِ طلوع اسلام کو بالعموم اور بزم مردان کو بالخصوص، ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔

ادارہ، اراکینِ بزم مردان، اور مرحوم کے پس ماندگان کے اس غم میں برابر کا شریک ہے اور دست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں آسائش عطا فرمائے۔

غم گسار

ناظم ادارہ طلوع اسلام

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

کے ذریعے حسبِ ذیل مقامات اور — جسے مقامی بزم ہائے طلوعِ اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ، کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز — اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے۔

نام بزمِ طلوعِ اسلام	دن اور وقت	مقامِ درس کے کوائف :-	نوٹ :- پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور بھی بزموں کے لئے ریکارڈ کرلئے جاتے ہیں۔
لاہور	جمعہ ۹ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰	
لندن (انگلینڈ)	ہرماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD, TEL: 553-1896	
برمنگھم (انگلینڈ)	ہرماہ کا پہلا اتوار دو بجے دوپہر (بمقام)	60, HERICK RR SALTLEY, B8 INT.	
اوسلو (ناروے)	ہرماہ کا پہلا اتوار شام ۶ بجے (بمقام)	MR MANZOOR AHMAD, DOVRE GATE-7/OSLO-1	
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہرماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE - #311, DOWNS VIEW TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P5. PHONE (416) 661-2827	
کراچی ۲	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	کتب خانہ بزم طلوعِ اسلام کمرہ ۲۲ ہارون چیمبرز۔ الطاف حسین روڈ نیو چالی۔ فون ۲۳۸۸۲۸	
پشاور (۱) (۲)	(۱) ہر جمعہ ۵ بجے شام (۲) ہر جمعہ ۹ بجے صبح	(۱) رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر (OPP: VIP MAINGATE) پشاور سٹیڈیم بارہ روڈ۔ فون ۴۰۶۵۰ (۲) ہوٹل نعمت کدہ۔ یونیورسٹی روڈ۔ جہانگیر آباد۔	
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف۔ محمود علی صاحب۔ اکاخیل بلڈنگ نواب علی روڈ	
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی ۔ ۱۶۶ لیاقت روڈ	
لیہ	ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ	شبیر میکنیکل انجینئرنگ ورکس ۔ شہید روڈ (لیہ)	
ایبٹ آباد	ہر جمعہ ۴ بجے شام	رہائش گاہ صلاح الدین صاحب۔ واقع 234-K-L کہیال (ایبٹ آباد)	
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی مکان نمبر ۔ نظامی منزل	
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ۔ غنی پورہ باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب۔	
چکوال	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	ضیا ٹیوشن سنٹر نزد بجوہری مسجد باہتمام ماسٹر غلام حسین صاحب نمائندہ بزم طلوعِ اسلام۔	
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر، توغی روڈ۔ باہتمام غلام صابر صاحب	
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم ملحق رہائش گاہ :- چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ سول لائنز	
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ و ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	بمقام ۔ ۱/۱/۱۲ بی ۔ لکھیر روڈ ... باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ	
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوعِ اسلام (بازار کلاں)	
ملتان	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون ... ۳۱۰۷۱)	
پنجکسی (تحصیل کبیر والا)	ہر جمعہ ۲ بجے سہ پہر	بمقام ۔ مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)	
ہنگو	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون ۲۶)	
فیصل آباد	ہر جمعہ ۲ بجے بعد دوپہر	بمقام ۔ حیات سرجری کلینک ۲۳/۲ پیپلز کالونی ۲ (فون ۴۲۸۵۵)	

باسمہٖ تعالیٰ

بتقریب یوم پاکستان ۱۹۸۲ء

پاکستان کا تصوّر کس نے دیا تھا؟

یہ نہ قادیانیت کی تخلیق تھا، نہ انگریز کی سازش

خان عبدالولی خان کے الزام کی حقیقت

پرویز

چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

افسانے اور حقیقت

نظیریؔ! کاش بنمائی کہ در ساغر چہ می داری
کہ پیشِ زاہداں قدرِ گنہ گاراں شود پیدا

عزیزانِ گرامی قدر! السلام علیکم

۲۳ مارچ کا دن، ہماری ملّی زندگی میں ابدی اہمیت کا حامل ہے۔ (آج سے بیالیس سال پہلے) اس روز ہم نے حصولِ آزادی کے عزم کا اعلان کیا تھا۔ آزادی کی عظمت و اہمیت کس قدر ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب حضور نبی اکرمؐ، ہجرت کے بعد، مدینہ تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ یہودی عاشورہ کا روزہ رکھتے ہیں۔ دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ اس روز بنی اسرائیل نے فرعون کی غلامی سے آزادی حاصل کی تھی۔ ہم اس کی یاد میں جشنِ مسرت مناتے اور شکرانے کا روزہ رکھتے ہیں۔ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ہمیں بھی اس دن کا روزہ رکھنا چاہیئے کیونکہ کسی قوم کا مستبد انسانوں کی محکومیت سے رستگاری حاصل کر لینا، اسی قوم کے لئے باعثِ مسرت نہیں۔ یہ پوری کی پوری نوعِ انسان کے لئے وجہِ فخر و انبساط ہے۔ غلامی انسانیت کے لئے وجہِ تذلیل ہے، اور آزادی، آدمیت کے لئے باعثِ سرفرازی۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ دین کی منزل اَلْعَقَبَة کے مرادف ہے۔ یعنی پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنے کے مرادف۔ اتنا کہنے کے بعد فرمایا: وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ...... (۹۰/۱۲) "تمہیں کچھ معلوم ہے کہ "پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنے" سے مراد کیا ہے؟ تمہیں معلوم تو سن لو کہ اس سے مراد ہے: فَكُّ رَقَبَةٍ ..... (۹۰/۱۳) "نوعِ انسان کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانا"۔ یہ ہے الدین کی منزل کا قدمِ اوّل[1]۔ خود حضور نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ...... (۷/۱۵۷) "وہ ان زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں نوعِ انسان جکڑی چلی آ رہی تھی، اور ان کے سر سے ان سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے بوجھ تلے وہ دبی ہوئی تھی"۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اسلام میں آزادی کی قدر و قیمت کیا ہے، اور اسی سے پھر اس کا بھی اندازہ

[1] یہ تو ہے قرآن کی رُو سے غلامی کی کیفیت، اور ہماری مذہبی پیشوائیت، غلام اور لونڈیوں کو عین مطابقِ اسلام قرار دیتی ہے!

لگا لیجئے کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی اہمیت کیا! میرے لئے تو اس تقریب کی یاد ایک اور جہت سے بھی فردوسِ قلب و دماغ ہے کہ میں اُس عیدِ نظارہ میں خود شامل تھا جس میں اس عزمِ آزادی کا اعلان کیا گیا تھا اور اس معرکۂ آرائی میں شریک جس کا فاتحانہ انجام حصولِ پاکستان تھا ——— جس جگہ اب مینارِ پاکستان سرفراز ہے۔ وہاں مسلم لیگ کے اجلاس کا پنڈال ایستادہ تھا اور اس کے باہر طلوعِ اسلام کا خیمہ نصب تھا جو سیاسی مذاکرات کی آماجگاہ تھا۔ میں بھلا زندگی کی ان حسین ساعتوں کو کیسے فراموش کر سکتا ہوں؟

لیکن آزادی کی قدر و قیمت تو وہی قوم جان سکتی ہے جس نے اسے خون کی قیمت دے کر حاصل کیا ہو! جس قوم کو، ایک قطرۂ خون بہائے بغیر، ایسی عظیم مملکت مفت میں مل جائے، وہ نہ اس کی قدر و قیمت جان سکتی ہے، اور نہ اُس محسنِ ملّت کا مقام پہچان سکتی، جس نے اسے اس متاعِ بے بہا کا مالک بنا دیا۔ یہی نہیں کہ اس قوم نے اس محسن کے مقام کو نہیں پہچانا، اس نے اس کی عظمت کو داغدار کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے، ۲۵ دسمبر ۱۹۸۱ء کو "قائدِ اعظمؒ کے یومِ پیدائش کی تقریب پر اپنے خطاب میں کہا تھا کہ جن لوگوں نے مطالبہ اور حصولِ پاکستان کی جدّ و جہد کی انتہائی مخالفت کی تھی، وہ تشکیلِ پاکستان کے بعد ہجوم کر کے ادھر آ گئے، اور یہاں اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے مختلف سازشوں اور کاوشوں میں مصروفِ عمل ہیں[1]۔ انہی میں خان عبدالولی خان کا وہ شگوفہ ہے جو انہوں نے حال ہی میں چھوڑا ہے۔

وسوسہ انگیزی

قرآنِ کریم نے تیس پاروں میں اپنی تعلیم اور پیغام کو مکمل کر دینے کے بعد، آخری سورۃ میں، اُمّتِ مسلمہ کو متنبہ کیا ہے کہ تم، ان لوگوں کے خطرہ سے محتاط رہنا۔ ـــ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ...... (۱۱۴/۵) جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ کی چنگاری ڈال دیتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، قرآن کی رُو سے، اُمّت کے لئے سب سے بڑا خطرہ وسوسہ اندازی ہے۔ اور خان ولی خان نے اسی حربہ سے کام لیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے عوام دو باتوں سے بڑے (ALLERGIC) ہیں۔ اور انہیں بجا طور پر ایسا ہونا بھی چاہیئے۔ یعنی قادیانیت اور انگریز پرستی۔ جونہی کسی نے کہا کہ فلاں سکیم، قادیانیوں کی تراشیدہ ہے اور اس کا پیش کرنے والا انگریز کا آلۂ کار، تو عوام، اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ خان ولی خان نے اپنے انٹرویو میں (جو سب سے پہلے، ہفت وار چٹان کی ۲۱ دسمبر ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا) جو کچھ کہا اس کا ملخص یہ تھا کہ قائدِ اعظمؒ نے جو سکیم، مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں پیش کی تھی، وہ درحقیقت

انگریزیت اور قادیانیت

سر ظفر اللہ خان کی تخلیق تھی، جو اس زمانے کے وائسرائے لارڈ لنلتھگو کی تصویب کے ساتھ، ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسٹر محمد علی جناحؒ کو بھیجی گئی تھی۔ آپ نے غور فرمایا کہ خان صاحب نے، قائدِ اعظمؒ کے خلاف جذبۂ حقارت

[1] یہ خطاب اب پمفلٹ کی شکل میں شائع ہو گیا ہے جس کا عنوان ہے "تحریکِ پاکستان کے مخالف علماء"۔

اجاگر کرنے کے لئے، انہوں کس طرح دو تیروں کا ہدف بنایا! قائد اعظم کا سب سے بڑا معرکہ آرا کارنامہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان ہے۔ اس قرارداد کے متعلق یہ تاثر پیدا کرنا کہ وہ ایک قادیانی (سر ظفر اللہ خان) کی وضع کردہ، اور انگریز کی منشا کے مطابق تھی جس قدر خطرناک سازش ہوسکتی ہے، ظاہر ہے۔ خان صاحب، اپنے سیاسی کردار میں جس خصوصیت کو سب سے زیادہ وجۂ افتخار قرار دیتے ہیں وہ یہی ہے کہ وہ انگریز کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ اپنے آپ کو انگریز کا دشمن، اور جناحؒ کو انگریز کا آلۂ کار ٹھہرانے سے اپنی جس آتشِ انتقام کا ٹھنڈا کرنا مقصود ہوسکتا ہے، ماہرین نفسیات اس کا بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں۔ باقی رہا یہ کہ اس سکیم کے ایک قادیانی کی طرف منسوب کرنے سے عوام کے دل میں کس قسم کے جذباتِ نفرت اُبھر سکتے ہیں، اس کے لئے دو ایک شہادات کا پیش کیا جانا کافی ہوگا۔ واضح رہے کہ میں ان شواہد کو محض حقائق کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ ان سے کسی کا استخفاف مقصود نہیں۔

(۱) سر ظفر اللہ خان جس مذہب کے پیرو ہیں، اس کے بانی (میرزا غلام احمد صاحب) نے انگریزوں کی اطاعت کو مذہبی فریضہ قرار دیا تھا۔ قرآنِ مجید میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اَطِيعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ...... (۴/۵۹) " یعنی، تم خدا کی اطاعت کرو۔ رسول کی اطاعت کرو۔ اور تم میں سے جنہیں کچھ اختیارات سونپ دیئے جائیں، ان کی اطاعت کرو۔" میرزا صاحب نے اس آیت کی تشریح میں لکھا تھا۔

> اولی الامر سے مراد جسمانی طور پر بادشاہ اور روحانی طور پر امام الزمان ہے جسمانی طور پر جو شخص ہمارے مقاصد کا مخالف نہ ہو اور اس سے مذہبی فائدہ ہمیں حاصل ہوسکے وہ ہم میں سے ہے۔ اس لئے میری نصیحت اپنی جماعت کو یہی ہے کہ وہ انگریزوں کی بادشاہت کو اپنے اولی الامر میں داخل کریں اور دل کی سچائی سے ان کے مطیع رہیں۔
>
> (ضرورت الامام - صفحہ ۲۳)

انہوں نے اپنے اشتہار مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۸۹۴ء میں لکھا تھا کہ

> میں سولہ برس سے برابر اپنی تالیفات میں اس بات پر زور دے رہا ہوں کہ مسلمانانِ ہند پر اطاعت گورنمنٹ برطانیہ کی فرض اور جہاد حرام ہے۔ (تبلیغ رسالت جلد سوم ص ۱۹۶)

میرزا صاحب کی اس قسم کی تحریریں بکثرت پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن میں انہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ مزید تفصیلات میری کتاب "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" میں مل سکیں گی۔

(۲) مسلمان اس واقعہ کو کیسے بھول سکتے ہیں کہ سر ظفر اللہ خان نے قائدِ اعظمؒ کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی تھی، دراں حالیکہ وہ لاکھوں مسلمانوں کے مجمع میں، قائدِ اعظمؒ کی میت کے قریب کھڑے تھے۔[1]

---

[1] سر ظفر اللہ خان کی اس جرأت کی داد نہ دینا خلافِ انصاف ہوگا کہ انہوں نے ایسے نازک وقت میں بھی اپنے عقیدہ کے اظہار میں کسی مداہنت یا دلپذیری سے کام نہیں لیا تھا۔

(۳) سر ظفر اللہ خان جس جماعت (جماعتِ احمدیہ) سے متعلق ہیں، اس نے پاکستان کو کبھی نہیں اپنایا۔ اس جماعت کے امیر مرزا بشیر الدین محمود (خلیفہ ثانی) نے تحریکِ پاکستان کے دوران، ایک سوال کے جواب میں (کہ اب جبکہ پوری مسلمان قوم نے پاکستان کے مطالبہ کو اپنا لیا ہے، آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے) کہا تھا کہ

بے شک مسلمان زور لگاتے رہیں۔ جس مادی قسم کا پاکستان وہ چاہتے ہیں وہ کبھی نہیں بن سکتا۔

(روزنامہ الفضل ۸ رجون ۱۹۴۴ء بحوالہ پیغامِ صلح مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۷۳ء)

یعنی "روحانی پاکستان" تو ان کے نزدیک، قادیان میں بن چکا تھا جس قسم کا پاکستان مسلمان چاہتے تھے وہ کبھی نہیں بن سکے گا۔

جب پاکستان کا مطالبہ منظور ہو گیا تو ان سے پوچھا گیا کہ اب وہ کیا کہتے ہیں تو انہوں نے کہا:-

ہندوستان کی تقسیم پر ہم راضی ہوئے ہیں تو خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری سے۔

اور پھر کوشش کریں گے کہ کسی نہ کسی طرح جلد متحد ہو جائیں۔

(الفضل - ۱۶ رمئی ۱۹۴۷ء - بحوالہ پیغامِ صلح مذکور)

پاکستان کی سکیم کو ان حضرات کی طرف منسوب کرنے سے جس قسم کے تاثرات پیدا ہو سکتے ہیں، ظاہر ہے۔ اس باب میں خان ولی خان کی "سادگی و پرکاری" کی داد نہ دینا خلافِ انصاف ہوگا۔

(۰)

خان ولی خان کے اس بیان (اور بعد کی تشریحات) پر ملک میں کافی لے دے ہوئی لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس بحث میں بالعموم جذبات سے کام لیا گیا، حقائق کو پیش نہیں کیا گیا۔ خان صاحب نے جو کچھ کہا ہے، وہ انہیں سے مختص نہیں۔ اصل یہ ہے کہ جو لوگ اسلام (الدین) کی کنہ وحقیقت سے واقف نہیں، (وہ خواہ سیکولر لیڈر ہوں اور خواہ مذہب پرست علماء) مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ ان کی سمجھ میں آ نہیں سکتا یا وہ سمجھنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک اس سلسلہ میں بڑے بڑے دانشورانِ قوم کی طرف سے جو کچھ کہا گیا ہے، وہ پاکستان کے جذبۂ محرکہ سے ناواقفیت کا غماز ہے۔ متفقہ طور پر یہ کہا جاتا رہا کہ یہ ہندو کی تنگ نظری اور تعصب تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں نے تنگ آ کر علیحدگی کا فیصلہ کیا۔ بعض نے کہا کہ اس مطالبہ کی پشت پر معاشی مفادات کا جذبہ کارفرما تھا۔ بعض نے اسے قائدِ اعظمؒ کی انانیت کا مظاہرہ قرار دیا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ خان ولی خان صاحب کے الزام کے جواب میں بھی ایسا کچھ ہی کہا گیا ہے۔ میں اس باب میں جذبات سے کام نہیں لوں گا۔ حقائق اور شواہد کی رُو سے واضح کرنے کی کوشش کروں گا کہ

(۱) مطالبہ اور قیامِ پاکستان کا حقیقی جذبۂ محرکہ، اور مقصود و منتہیٰ کیا تھا؟

(۲) کیا یہ خیال ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کے بعد کا آوردہ تھا؟

(۳) کیا یہ انگریز کی پسندیدہ سکیم تھی؟

(۴) کیا قائدِ اعظمؒ انگریز کے آلہ کار تھے۔

میں ان حقائق کو تشکیلِ پاکستان سے پہلے بھی پیش کرتا رہا تھا، اور اس کے بعد بھی پیش کرتا چلا آ رہا ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ بحث کے تناظر میں ان کا بیک وقت سامنے آ جانا، فائدہ سے خالی نہیں ہوگا۔

(۰)

پہلا پاکستان

مطالبۂ پاکستان کے سلسلہ میں جو شکوک یہاں ابھارے گئے اور ابھارے جا رہے ہیں، اسی قسم کے شکوک "پہلے پاکستان" کے سلسلہ میں بھی پیدا کئے جاتے ہیں۔ "پہلے پاکستان" کے الفاظ آپ کو انوکھے سے لگیں گے۔ لیکن میں نے یہ الفاظ ان کے حقیقی معانی میں استعمال کئے ہیں۔ یعنی "پاکیزہ سیرت حضرات کا مسکن جس میں قرآن کی حکمرانی ہو"۔ یہ حقیقی پاکستان آج سے چودہ سو سال پہلے حجاز کی ارضِ پاک میں متشکل ہوا تھا۔ غیر مسلم مؤرخین، خواہ وہ سیکولر ذہنیت کے حامل ہوں اور خواہ کسی مذہب کے پیرو، اس کے جذبۂ محرکہ کا صحیح اندازہ کر نہیں سکتے۔ چنانچہ وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ جبتک مکہ میں رہے، ان کی حیثیت ایک مصلح یا مبلغ کی تھی۔ مدینہ جاکر جب کچھ قوت مجتمع ہوتی نظر آئی تو آپؐ کے دل میں مملکت سازی کا خیال پیدا ہوا۔ ان لوگوں کا یہ خیال، نہ صرف یہ کہ دین کی حقیقت سے عدمِ واقفیت کی دلیل ہے، خود تاریخی حقائق کے بھی خلاف ہے۔ تاریخ الکامل (ابن اثیر) میں ہے کہ.... رسول اللہؐ نے اپنی دعوت کے آغاز میں، جو پیغامات خود اپنے اہلِ خاندان کے نام بھیجے تھے، ان میں کہا تھا کہ

> یاد رکھو! تمہاری قوم میں آجتک کوئی ایسا جوان پیدا نہیں ہوا جس نے تمہارے سامنے اس نصب العین سے بہتر نصب العین رکھا ہو جسے میں پیش کر رہا ہوں۔ میں تمہارے پاس دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری کے لئے آیا ہوں۔ خدا کی بالادست حکومت کی طرف سے مجھے ہدایت ملی ہے کہ میں تمہیں اس کی طرف دعوت دوں۔ مجھے اس (حکومت) کے امور سرانجام دینے کے لئے وزراء کی ضرورت ہوگی۔ کون ہے جو میرے ساتھ وزیر کی حیثیت سے کام کرے؟

اس کے بعد حضورؐ نے اپنی دعوت کے تیسرے سال ان لوگوں کو "حکومتِ خداوندی" کے لئے جمع ہونے کی دعوت دی اور فرمایا کہ "یاد رکھو! یا تو خدا کا حکم غالب ہوگا اور یا میں اپنی جان سے گذر جاؤں گا"۔ اسی تاریخ (الکامل) میں مذکور ایک اور واقعہ بھی قابلِ غور ہے۔ ایک دفعہ قبیلۂ عامر کا ایک معزز اور بزرگ سردار آپؐ کے حلقۂ دعوت میں پہنچا اور اس کے متعلق بہت سے سوالات کئے۔ اسی سلسلہ میں اس نے کہا کہ لکل قول حقیقة وما حقیقة قولك۔ ہر دعویٰ کا کوئی ٹھوس ثبوت ہوتا ہے۔ آپؐ کے دعویٰ کی صداقت کا ٹھوس ثبوت کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں اپنے باپ ابراہیمؑ اور اپنے بھائی عیسےٰؑ کی ذمہ داریوں، بشارتوں اور عظمت و اقتدار کا حامل ہوں۔ عامری نے کہا کہ اگر میں ان ذمہ داریوں کو پورا کر دوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ جنت کے باغات۔ اس نے کہا کہ یہ تو آخرت کی بات ہے۔

میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے مجھے اس دنیا میں کیا حاصل ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ

نِعْمَ النَّصْرُ وَالتَّمْكِيْنُ فِي الْبِلَادِ

خوش آئند فتوحات اور ملکوں پر حکومت۔ (شاہکارِ رسالت ص۱۴۷)

اور یہ محض قیاس آرائی نہیں تھی۔ خدا کے اس وعدہ پر یقینِ محکم کا لازمی نتیجہ تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ "ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے" (۲۴/۵۵) یہی وہ یقینِ محکم تھا جس کی بنا پر حضورؐ کبھی اعلان فرماتے تھے کہ "زمین کے مشرق و مغرب کے علاقے میرے ہاتھ میں ..... دیئے گئے ہیں"۔ کبھی اپنے رفقاء (صحابہؓ) سے فرماتے کہ "قیصر و کسریٰ کی شاہنشاہیوں کا خاتمہ ہو جائے گا"۔ اور یہ سب اس لئے کہ دین کا تمکن، اپنی آزاد مملکت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ (۲۴/۵۵) لہٰذا، یہ خیال غلط ہے کہ مکی دور میں تو آپؐ کی زندگی محض ایک مصلح کی سی تھی۔ قیامِ مملکت کا خیال مدنی زندگی میں جا کر پیدا ہوا۔ حضورؐ کی زندگی کا مقصد دین کا تمکن تھا اور دین کا تمکن اپنی آزاد مملکت کے بغیر ناممکن تھا۔ لہٰذا جب آپؐ نے دین کی دعوت کی ابتدا ہی کی تو مملکت کا تصور اس کے ساتھ شامل تھا۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جو نہ سیکولر سٹوں کی سمجھ میں آسکتی ہے (کیونکہ ان کے نزدیک، مملکت کو مذہب کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہوتا) اور نہ ہی مذہب پرستوں کی سمجھ میں (کہ ان کے نزدیک بھی مذہب کو مملکت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا) چنانچہ پہلا پاکستان "دین کے تمکن" کے لئے وجود میں لایا گیا تھا۔

صدرِ اوّل کے بعد، خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی اور دین "مذہب" بن کر رہ گیا۔ پھر مملکت کو دین سے کوئی تعلق نہ رہا۔ یاد رکھئے! جو حکومت قائم ہی غیر قرآنی طریق سے ہو اس میں دین بار نہیں پا سکتا۔ وہ حکومت سیکولر ہوتی ہے خواہ حکمران مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ صورتِ حالات صدیوں سے برابر چلی آ رہی تھی کہ ہمارے دور میں ایک قرآنی مفکر (اقبالؒ) نے اس فراموش کردہ حقیقت کی یاد دہانی کرائی کہ ہم جس اسلام کے پیرو چلے آ رہے ہیں، وہ دین نہیں مذہب ہے۔ دین کا قیام صرف اُس آزاد مملکت میں ممکن ہے جس میں قرآن کی حکمرانی ہو۔ شدہ شدہ تو وہ اس حقیقت کو ایک عرصہ سے پیش کرتے چلے آ رہے تھے لیکن اسے ایک متعین سکیم کی شکل میں، انہوں نے ۱۹۳۰ء کے الٰہ آباد کے خطبہ میں پیش کیا۔ وہ خطبہ ہماری ملّی زندگی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے گہرے فکر و تدبّر کا محتاج۔ اس مقام پر میں اس کے چند ایک اقتباسات پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ انہوں نے اپنے خطبہ کا آغاز ان الفاظ سے کیا:۔

اقبالؒ کا پیش کردہ تصوّر

آپ حضرات نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو عقیدہ رکھتا ہے، اور اپنے اس عقیدہ میں مایوسی کا کوئی شائبہ نہیں پاتا، کہ اسلام ایک زندہ اور پائندہ قوت ہے جو انسانی نگاہ کو جغرافیائی حدود و قیود کے قفس سے آزاد کر کے اسے اس کی فطری وسعتوں میں اذنِ بال کشائی دے گا۔ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ دین، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین قوت کا حامل ہے اور جسے اس کا محکم یقین ہے کہ اسلام خود

تقدیرِ الٰہی ہے۔ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں رہیں گی، اور اس کی تقدیر کسی کے ہاتھ میں نہیں ہوگی۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ تمام مسائل کو اپنے خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھے۔ یہ ہرگز نہ خیال فرمائیے کہ جس مسئلہ کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ کوئی نظری مسئلہ ہے نہیں۔ یہ تو ایک زندہ اور عملی مسئلہ ہے جو خود نفسِ اسلام پر بحیثیت ایک نظامِ حیات و عمل کے اثر انداز ہوگا۔ اس مسئلہ کے صحیح اور مناسب حل پر ہی اس امر کا انحصار ہے کہ آپ حضرات ہندوستان میں ایک ممتاز تہذیب کے علمبرداروں کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں گے۔

اس تمہید کے بعد انہوں نے، "مذہب اور دین" کے فرق کو ان الفاظ میں نمایاں کیا۔ فرمایا:-

حقیقت یہ ہے کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا نام نہیں یہ ایک نظامِ حکومت ہے جس کی ہیئتِ ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عملِ خیر کو اپنے اندر جذب کرے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح بالکل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے۔ بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فیٹ ہو۔ وہ ایک فعّال مشینری کا پرزہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز میں چلانے کے لئے اس پر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

اس نظری بحث کے بعد وہ اس عملی سوال کی طرف آئے جس کے لئے یہ تمہید اٹھائی گئی تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے کہا:-

ہندوستان دنیا بھر میں بہت بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ میں، کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانیہ کی حکومت قائم ہے، (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخر الامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا۔

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا:-

تنہا ایک ملک میں سات کروڑ* فرزندانِ توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں۔ تمام مسلم ایشیا

---

* سنہ ۱۹۳۰ء میں ہندوستان میں مسلمانوں کی اتنی ہی تعداد تھی۔

کے ممالک مجموعی طور پر بھی اسلام کے لئے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلہ کو صرف اس نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں اسلام کا کیا حشر ہوگا بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطۂ خیال سے بھی کہ ہماری موت اور حیات کا عالمِ اسلام پر کیا اثر ہوگا۔

اُن کی بصیرت نے یہاں تک کہہ دیا کہ

مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے۔

اُس وقت کے حالات کے مطابق اس مسئلہ کا انہوں نے عملی حل یہ بتایا کہ

پاکستان کا ہیولیٰ

میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔۔۔۔۔۔ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔

اس مملکت کے قیام سے ہوگا کیا؟ فرمایا کہ

اس سے اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی صحیح معنوں میں تجدید ہو سکے گی، بلکہ وہ زمانہ مآل کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔

اسی حقیقت کو انہوں نے اس سے بھی دو برس پہلے اپنے خطبات تشکیلِ جدید (کے چھٹے خطبہ) میں سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہمنوائی میں، ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

اندریں حالات ہمارے لئے کشادِ کار کی ایک ہی راہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آئینۂ اسلام پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں، اور جس کی وجہ سے اس کا ترکیبی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے، انہیں کھرچ کھرچ کر الگ کیا جائے، اور حریت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سرِ نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیلِ جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی، اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ اقبالؒ کی یہ دعوت کیا تھی؟ ایک ایسی مملکت کا قیام جس میں دین ایک زندہ حقیقت کی صورت میں نفاذ پذیر ہو سکے! یہ اسی دعوتِ ربّانی کی صدائے بازگشت تھی جو "پہلے اور حقیقی پاکستان" کے قیام کے سلسلہ میں بلند ہوئی تھی۔ اس میں قدم اوّل اس "مذہب" سے پیچھا چھڑانا تھا، جس نے دین کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اقبالؒ کے کلام میں، مُلّا، فقیہہ اور صُوفی کے خلاف جو کچھ کہا گیا

ہے (اور بہ تکرار و اصرار کہا گیا ہے) اس کا مقصد یہی ہے۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس (منعقدہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء) کے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا:-

تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند فطری، ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

یہ تھا مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ جو نہ کسی مذہب پرست (سر) ظفر اللہ خان کے تصوّر میں آ سکتا تھا، نہ سیکولرازم کے حامی، کسی ولی خان کی سمجھ میں یہ اسی کی سمجھ میں آ سکتا تھا جو اس حقیقت پر یقین رکھتا ہو کہ ایک آزاد مملکت کا قیام جس میں قرآن کی حکمرانی ہو، خود اسلام کا تقاضا ہے۔ اس کے بغیر مسلمان، اسلام کے مطابق زندگی بسر ہی نہیں کر سکتے۔

(۰)

جناحؒ کی ہمنوائی

محمد علی جناح (قائدِ اعظمؒ) اس زمانے میں ہنوز نیشنلسٹ تھے اور ہندو۔ مسلم اتحاد کے زبردست داعی لیکن وہ اپنی کوششوں میں ناکام ہو کر، ایک شکست خوردہ سپاہی کی طرح، انگلستان کے گوشۂ تنہائی میں جا گزین ہو چکے تھے۔ اقبالؒ کی نگاہِ دوررس نے بھانپ لیا تھا کہ ان کے اس تصوّر کو عملی پیکر عطا کرنے کے لئے یہی (اور صرف یہی) مردِ میداں موزوں ہو سکتا ہے۔ انہوں نے "نیشنلسٹ جناح" کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ حتمی طور پر کہا نہیں جا سکتا کہ اس سلسلہ کا آغاز کب سے ہوا۔ ان کے سوانح نگار (HECTOR BOLITHO) نے اپنی کتاب (JINNAH) میں لکھا ہے کہ

مسٹر جناح نے لندن میں، سر محمد اقبالؒ سے بہت سی ملاقاتیں کیں۔ وہ بڑے اچھے دوست تھے۔ مسٹر جناح اگرچہ (اپنے سابقہ سیاسی مسلک کے متعلق) اب کسی غلط فہمی میں نہیں تھے۔ بایں ہمہ وہ اقبالؒ کے دلائل سے (اتنی جلدی) متفق نہیں ہوئے۔ اس میں قریب دس سال[1] کا عرصہ لگ گیا کہ مسٹر جناحؒ نے اس کا اعتراف کیا کہ ہندوستان کی سیاست کے گہرے مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ اقبالؒ کا نقطۂ نظر صحیح ہے۔ (ص ۹۰)

اس کے بعد جب مسٹر جناحؒ واپس وطن آئے تو اس مصنّف نے اس وقت کی کیفیت کا نقشہ ان الفاظ

---

[1] مصنّف کو اس میں کچھ تسامح ہو گیا ہے۔ ان کے خیالات میں ہم آہنگی بہت پہلے ہو گئی تھی۔

میں کھینچا ہے:۔

> مسٹر جناح اپنے بمبئی کے مکان میں بالکل تنہا تھے۔ ان کے پاس کوئی ذاتی سٹاف نہیں تھا حتیٰ کہ سیکرٹری بھی نہیں جو ان کے خطوط کی نقلیں رکھ سکتا اور ان کے کاغذات کو باقاعدہ فائل کئے جاتا۔ اس بے قاعدگی کے باوجود ان کے دراز میں خطوط کا ایک ایسا بنڈل تھا جس سے وہ تسکین خاطر حاصل کیا کرتے تھے۔ یہ وہ خطوط تھے جو (اقبالؒ نے) انہیں انگلستان میں ۱۹۳۲ء میں کی گئی ملاقات کے بعد لکھے تھے۔۔۔۔۔ (صفحہ ۱۱۴)

ان خطوط کے تذکرہ کے درمیان ایک ضمنی واقعہ۔۔۔ علامہ اقبالؒ جب گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں لندن تشریف لے گئے ہیں، تو چوہدری رحمت علی (مرحوم) نے (جو اس زمانے میں وہاں طالب علمی کی زندگی بسر کر رہے تھے) حضرت علامہؒ کے تصور کی اسلامی مملکت کا خاصا چرچا کر رکھا تھا۔ عام طور پہ مشہور ہے کہ لفظ "پاکستان" بھی انہی کا وضع کردہ ہے۔ لیکن، مسٹر عبدالوحید خان نے، اپنی کتاب (INDIA WINS FREEDOM_THE OTHER SIDE) میں لکھا ہے کہ یہ نام، درحقیقت، علامہ اقبالؒ کا تجویز فرمودہ تھا۔ (صفحہ ۱۲) مجھے اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو

اقبالؒ کے خطوط

صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ۳۲-۱۹۳۱ء میں، علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ تصورِ پاکستان کا چرچا عام ہو گیا تھا۔ انہوں نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو، قائدِ اعظمؒ کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ

> انگلستان سے واپسی سے پہلے، لارڈ لوتھین نے مجھ سے کہا تھا کہ ہندوستان کے مصائب کا حل صرف تمہاری سکیم کی رُو سے ہو سکتا ہے لیکن اسے بروئے کار آنے میں شاید پچیس سال کا عرصہ لگ جائے۔ (جناحؒ کے نام خطوط۔ صفحہ ۲۱)

ہیکٹر بولیتھو نے جن خطوط کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض خطوط، خود قائدِ اعظمؒ کے تعارف کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔ علامہ اقبالؒ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> اسلامی قانون کے ایک عرصۂ دراز کے مطالعہ کے بعد، میں اس نتیجہ پہ پہنچا ہوں کہ اگر اس قانون کو اچھی طرح سمجھ کر اسے نافذ کر دیا جائے، تو کم از کم ہر فرد معاشرہ کو رزق کی ضمانت تو مل جائے گی۔
>
> لیکن مسلمانوں کی ایک یا ایک سے زیادہ آزاد مملکتوں کے بغیر اسلامی شریعت کا نفاذ اور ارتقا ناممکن ہے۔۔۔۔۔۔ اس مقصد کے لئے ملک کی تقسیم اور اکثریتی علاقوں میں آزاد مسلم مملکت یا مملکتوں کا قیام ناگزیر ہے۔ (صفحہ ۱۸-۱۶)

قائدِ اعظمؒ نے ان خطوط کا بڑا تفصیلی تعارف لکھا ہے جس میں مسئلہ تقسیم ہند پہ کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:۔

> ۔۔۔۔۔۔ ان خطوط کی تاریخی اہمیت بڑی زیادہ ہے۔ بالخصوص وہ خطوط جن میں اقبالؒ

نے واضح اور غیر مبہم طور پر مسلم ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے سلسلہ میں اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ ان کے خیالات مجموعی طور پر میرے خیالات سے ہم آہنگ تھے اور ہندوستان کو جو آئینی مسائل درپیش تھے ان کے گہرے مطالعہ اور غور و خوض کے بعد آخراً میں بھی انہی نتائج تک پہنچا جو سر اقبالؒ کے تھے۔ یہی تصورات تھے جو اپنے وقت پر آکر مسلمانانِ ہند کے متفقہ عزم کی شکل میں نمودار ہوئے اور لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کی اُس قرارداد کی صورت اختیار کر گئے جسے عام طور پر قراردادِ پاکستان کہا جاتا ہے اور جو ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو منظور کی گئی تھی۔ (صفحہ ۵ - ۴)

آپ نے غور فرمایا کہ تقسیم ہند کی جس سکیم کو خان ولی خان صاحب، سر ظفر اللہ خان کے ذہن کی تراشیدہ اور لارڈ لنتھگو کی پسندیدہ قرار دیتے ہیں، اس کا سرچشمہ کیا تھا اور وہ کن مراحل کو طے کر کے ۱۹۴۰ء کے لیگ کے سیشن تک پہنچی تھی؟

ابھی تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے خیالات میں ہم آہنگی کی ابتدا ۱۹۳۱-۳۲ء سے ہوئی تھی۔ لیکن (لاہور کے) روزنامہ جنگ، بابت ۱۰ر فروری ۱۹۸۲ء میں شائع شدہ حسب ذیل خبر اس سلسلہ کو اور بھی پیچھے لے جاتی ہے۔ لکھا ہے:۔

تحریک پاکستان کے بارے میں جدید تحقیق کے نتیجہ میں یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ قائدِ اعظمؒ اور حکیم الامت کے درمیان ۱۹۲۹ء ہی سے اس بارے میں ہم آہنگی موجود تھی کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی مشکلات کا واحد حل ان کے علیحدہ وطن کے قیام میں مضمر ہے۔ اس موافقت اور ہم آہنگی کا اظہار ۱۹۳۰ء میں ہوا جب علامہ اقبالؒ نے الٰہ آباد کے مقام پر اپنا معروف خطبہ پیش کیا۔ یہ شہادت ان دستاویزات کی روشنی میں سامنے آئی ہے جو پاکستان کے معروف قانون دان شریف الدین پیرزادہ نے لندن کی انڈیا آفس لائبریری سے حاصل کی ہیں.....

جیسا کہ میں اس المیہ کو متعدد بار دھرا چکا ہوں، ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ نہ تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ ابھی تک شائع ہوئی ہے اور نہ ہی قائدِ اعظمؒ کی کوئی قابلِ اعتماد سوانح حیات — ان موضوعات کے متعلق تحقیق ہو تو معلوم کس کس قسم کے نادر کوائف منصۂ شہود پر آئیں۔

اس مقام پر ایک لمحہ کے لئے رکئے اور ایک ایسی درخشندہ حقیقت کو سامنے لائیے جس سے آپ کی نگاہوں میں چمک پیدا ہو جائے گی — ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان ہر دو زعمائے ملت (علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ) میں فکر و نظر کی کس قدر ہم آہنگی اور مقاصدِ زندگی میں کس قدر یک رنگی پیدا ہو چکی تھی۔ جہاں تک عظمتِ مقام کا تعلق ہے دونوں میں کچھ فرق نہیں کیا جا سکتا۔ بایں ہمہ، ان کے باہمی تعلقات کس قسم کے تھے اس کا سمجھ لینا ضروری ہے کیونکہ اس تحریک کو جو محیر العقول کامیابی ہوئی اس میں اس عنصر کا بہت بڑا حصہ ہے۔

جنوری ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے کہ پنڈت جواہر لعل نہرو، حضرت علامہؒ سے ملنے کے لئے آئے۔ ان کے ساتھ میاں افتخار الدین مرحوم بھی تھے۔ دورانِ گفتگو میاں صاحب نے علامہؒ سے کہا کہ "ڈاکٹر صاحب! آپ مسلمانوں کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے۔ مسلمان، مسٹر جناحؒ سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں"۔ علامہؒ صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ یہ سنتے ہی غصے میں آگئے۔ اٹھ کر بیٹھ گئے اور انگریزی میں کہنے لگے۔

"اچھا! تو چال یہ ہے کہ آپ مجھے بہلا پھسلا کر مسٹر جناحؒ کے مقابلہ پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناحؒ ہی مسلمانوں کے اصلی لیڈر ہیں۔ میں تو ان کا ایک معمولی سپاہی ہوں۔ (اقبالؒ کے آخری دو سال" صفحہ ۵۳۲۔ عاشق حسین بٹالوی)۔

یہ تو رہا علامہؒ کی نظروں میں قائدِ اعظمؒ کا احترام۔ دوسری طرف قائدِ اعظمؒ کو لیجئے۔ انہوں نے ۲ مارچ ۱۹۴۱ء کو یوم اقبالؒ کی ایک تقریب پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> مرحوم دورِ حاضر میں اسلام کی تاریخ تھے۔ اس زمانے میں اقبالؒ سے بہتر اسلام کسی اور شخص نے نہیں سمجھا۔ مجھے اس کا فخر ہے کہ میں نے ان کی قیادت میں بحیثیت ایک سپاہی کے کام کیا ہے۔ (ہفتہ وار حمایت اسلام۔ ۴ مارچ ۱۹۴۱ء)

یہ ہوتی ہیں عظیم انسانوں کی علامات! یہ دونوں فی الواقعہ عظیم انسان تھے۔ اس کی روشنی میں ذرا دورِ حاضر کے لیڈروں پہ نگاہ ڈالیے اور آنکھیں جھکا کر رہ جائیے!

(٥)

بہر حال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ تقسیم ہند کی سکیم علامہ اقبالؒ کے تصور کی تخلیق تھی جسے قائدِ اعظمؒ نے ۱۹۴۰ء میں پیش کیا تھا۔ نیشنلسٹ محمد علی جناحؒ کے مسلک میں اس قدر انقلاب ہی کچھ کم تحیر انگیز نہیں لیکن حقیقی اور ابطلاہر، ناقابلِ یقین انقلاب وہ ہے جو مسلمانوں کی حکومت اور اسلامی حکومت کی تفریق و تخصیص کے متعلق ان کی نگاہ میں پیدا ہوا۔ یہ وہ انقلاب تھا جس کا اظہار جستہ جستہ تو مختلف مقامات پہ ہوتا رہا، لیکن جامع طور پر، اس انٹرویو میں ہوا جو انہوں نے ۱۹۴۱ء میں عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد دکن) کے طلباء کو دیا تھا۔

حیدرآباد کا انٹرویو

میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح علامہ اقبالؒ کا ۱۹۳۰ء کا خطبۂ صدارت اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں اسلامی مملکت کی غرض و غایت کو نمایاں طور پر سامنے لایا گیا ہے اسی طرح قائدِ اعظمؒ کا ۱۹۴۱ء کا انٹرویو، اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ انہوں نے اسلام کو کس طرح صحیح طور پر سمجھا تھا۔ ملاحظہ فرمایئے:۔

اس انٹرویو میں ان طلباء نے پہلا سوال یہ کیا کہ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں۔ اس کے جواب میں قائدِ اعظمؒ نے فرمایا:۔

> جب میں انگریزی میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں

بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں، نہ ملا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے، اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

سوال:۔ اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت وغیرہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:۔ اشتراکیت، بالشویت یا دیگر اسی قسم کے سیاسی اور معاشی مسلک دراصل اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزا کا سا ربط اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

اس کے بعد ان طلباء نے یہ سوال کیا کہ ترکی حکومت ایک مادی حکومت (سیکولر اسٹیٹ) ہے۔ کیا اس سے اسلامی حکومت مختلف ہے؟ سوال آپ نے سن لیا۔ اب قائداعظمؒ کا جواب سنیئے اور غور کیجئے کہ کیا اس قدر جامع اور مانع الفاظ میں اسلامی حکومت کا صحیح تصور کہیں اور بھی ملتا ہے؟ فرمایا:۔

میرے خیال میں ترکی حکومت پر مادی حکومت کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز، سو یہ بالکل واضح ہے۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد ان طلبا نے سوال کیا کہ وہ مملکت ہمیں ہندوستان میں کس طرح مل سکتی ہے؟ اس کے جواب میں آپ نے کہا کہ مسلم لیگ۔ اس کی تنظیم اور اس کی جدوجہد اس کا رُخ، اس کی راہ، سب اس سوال کے جواب ہیں۔ اس جواب کے مختصر الفاظ میں تحریکِ پاکستان کی پوری غرض و غایت اور مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ سمٹ کر سامنے آجاتا ہے۔ اس کے بعد طلبا نے ایک دلچسپ سوال کر ڈالا۔ لیکن قائدِاعظمؒ نے اس کے جواب میں جو کچھ فرمایا اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ علامہ اقبالؒ کی ہم نوائی میں وہ بھی اس سے متفق تھے کہ ؎

میں جانتا ہوں انجام اس کا ۔۔۔ جس معرکے کے، ملا ہوں غازی

آپ، وہ سوال اور اس کا جواب ملاحظہ فرمائیے:۔

سوال :- جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریقِ کار دونوں میں بہترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہ وہاں اپنے ذہنی میلانات اور تصوراتِ زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار اور روبہ ترقی لا سکیں، تو پھر اس میں کونسا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کر دے؟

جواب :- دقت یہ ہے کہ جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت، بغیر اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیمِ عمل اور اس کے اصلی حدود کیا ہیں، ان امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے، اور اپنے حلقہ سے باہر اہلیت و استعداد کے باوجود مجھ میں یا آپ میں، (یعنی ان کے اپنے سوا کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، انہیں میں، ان مولوی صاحبان میں (الاماشاء اللہ) نہیں پاتا۔ (اور مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔

یہی وجہ ہے جو تشکیلِ پاکستان کے بعد قائداعظمؒ نے ساری دنیا سے برملا کہہ دیا تھا کہ مملکتِ پاکستان میں تھیاکریسی نہیں ہوگی۔

اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ نہ صرف یہ کہ یہ سکیم کسی قادیانی کی تخلیق اور انگریز کا "خود کاشتہ پودا" نہیں تھی بلکہ یہ بھی کہ یہ کوئی (آجکل کی اصطلاح میں) خالصتہً سیاسی تحریک بھی نہیں تھی۔ یہ دین کا تقاضا تھا جسے پورا کرنے کے لئے اقبالؒ اور جناحؒ سرگرمِ عمل تھے۔ اسی لئے قائداعظمؒ ملتِ اسلامیہ ہندیہ کو بار بار متنبہ کرتے تھے کہ

> اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان مٹ جائے تو اس کے لئے پاکستان نہ صرف یہ کہ ایک عملی نصب العین ہے بلکہ یہی اور صرف یہی واحد نصب العین ہے۔
> (دس مارچ ۱۹۴۱ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبا سے خطاب۔ تقاریر جلد اوّل ص ۲۶۷)

اور یہ کہ

> اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو نہ صرف یہ کہ ہم تباہ ہو جائیں گے بلکہ اس برِّصغیر میں مسلمانوں کا اور اسلام کا نام و نشان تک باقی نہیں رہے گا۔ (۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کو پاکستان ڈے کی تقریب پر پیغام۔ تقاریر جلد دوم۔ ص ۲۵۵)

(۰)

خان ولی خان صاحب نے اپنے انٹرویو میں تو یہ بات مجملاً کہی تھی کہ مسلم لیگ کی سنہ ۱۹۴۰ء کی سکیم انگریز کی ہدایت کے مطابق سر ظفر اللہ خان نے تیار کی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے ایک خط میں اسے متعین طور پر لکھ دیا۔ (خط کا پورا متن ہم ذرا آگے چل کر نقل کریں گے) اس میں انہوں نے کہا:-

> اس سے قبل زبانی طور پر تو ایک علیحدہ مسلم ریاست کی باتیں کی جا رہی تھیں لیکن کوئی تحریری دستاویز موجود نہ تھی اس لئے وائسرائے کی ہدایت کے مطابق مسٹر ظفر اللہ خان نے ایک

تجویز تیار کی جسے قرارداد کی شکل میں منظور کر لیا گیا۔

(چٹان - بابت یکم تا ۸ فروری ۱۹۸۲ء)

خان صاحب کو اگر واقعی تلاش ہوتی تو انہیں اس قسم کی دستاویز بھی مل جاتی۔ لیکن جب مقصد کیچڑ اچھالنا ہو تو پھر ہاتھوں میں پکڑی ہوئی دستاویزات بھی زیرِ آستین چلی جاتی ہیں۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں

سندھ پراونشل مسلم لیگ کی قرارداد

سندھ پراونشل مسلم لیگ کا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا جس کی صدارت خود قائدِاعظمؒ نے کی۔ اس اجلاس میں حسبِ ذیل ریزولیوشن پاس ہوا۔

سندھ پراونشل مسلم لیگ کے اس اجلاس کی رائے ہے کہ ہندوستان کے وسیع برِاعظم میں مستقل امن و امان قائم رکھنے، یہاں بسنے والی دو قوموں، یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے اپنے اپنے کلچر کو فروغ دینے، انہیں بغیر کسی رکاوٹ کے اپنی اپنی اقتصادی اور معاشرتی اصلاح کرنے اور انہیں سیاسی طور پر حقِ خود ارادیت عطا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان میں دو مختلف فیڈریشن قائم کئے جائیں جن میں سے ایک فیڈریشن مسلمانوں کا ہو اور دوسرا ہندوؤں کا۔

چنانچہ یہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے کانسٹی ٹیوشن کا خاکہ مرتب کرے جس کی رُو سے مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے، مسلم اکثریت رکھنے والی ریاستیں اور وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے، متحدہ طور پر ایک فیڈریشن کی صورت میں مکمل آزادی حاصل کر سکیں۔ اس فیڈریشن کو اس امر کی اجازت ہونی چاہیئے کہ اگر ضروری محسوس ہو تو بیرونِ ہند کی کسی اسلامی مملکت کو بھی فیڈریشن میں شریک کر سکے۔ اس فیڈریشن میں غیر مسلم اقلیتوں کو اسی قسم کے تحفظات عطا کئے جائیں گے جیسے ہندوستان کے غیر مسلم فیڈریشن میں مسلم اقلیتوں کو حاصل ہوں گے۔

(ہماری قومی جدّ و جہد - ۱۹۳۸ء - از عاشق حسین بٹالوی - ص ۱۵۸)

یہ قرارداد، سنہ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کا گویا طائرِ پیش رس تھی۔ فرمایئے! تقسیمِ ہند کی تجویز کے متعلق اس سے زیادہ واضح دستاویزی ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز اور ہندو دونوں، پورے کے پورے ملک کو، واحد فیڈریشن کے شکنجے میں جکڑ دینے کی فکر کر رہے تھے، اور قائدِاعظمؒ اس کی سخت مخالفت کرتے تھے۔

۲۵ مارچ ۱۹۳۹ء کو میرٹھ ڈویژنل مسلم لیگ کانفرنس کے اجلاس میں (نوابزادہ) لیاقت علی خان (مرحوم) نے اپنے خطبۂ صدارت میں پہلے کہا کہ "اگر فیڈریشن قائم ہو گیا تو یقین کیجئے کہ مسلمانوں کی حالت اچھوتوں جیسی ہو جائے گی"۔ اور آخر میں کہا کہ "اس مسئلہ کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ملک کو تقسیم کر لیا جائے"۔

(ہماری قومی جدّ و جہد - ۱۹۳۹ء - از عاشق حسین بٹالوی - ص ۹۵)۔

(۰)

خان ولی خان نے اپنے انٹرویو میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ جناحؒ، انگریز کے آلۂ کار تھے۔ جناب کو کسی نے ماں کی گالی دی تو اس نے کہا کہ ان بدبختوں کو گالی دینے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ بچے کو ماں کی گالی دینی چاہیئے۔ جوان کو بہن کی اور بوڑھے کو بیٹی کی۔ اسی استعارہ میں ہم یہ کہیں گے کہ محترم خان صاحب، جذبات کی شدت میں، جناحؒ کے خلاف الزام تراشی کا سلیقہ بھی بھول گئے۔ جناحؒ کو اگر انگریز پرست یا حکومت برطانیہ کا آلۂ کار کہا جائے تو اس کی تائید میں آپ کو کوئی سیکنڈ کرنے والا بھی نہیں ملے گا۔ اگر جناحؒ کی کسی ایک خصوصیت پر اپنے پرائے سب متفق ہیں تو وہ اس کی انگریز دشمنی ہے۔ میں نے اپنے پمفلٹ ——— حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ ——— میں تفصیل سے لکھا ہے کہ وہ کس طرح انگریز گورنروں، اور وائسراؤں سے ٹکر لیتے رہے۔ اور اس کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب انہوں نے ہنوز، بین الاقوامی تو ایک طرف، ملک گیر اہمیت بھی حاصل نہیں کی تھی۔ وہ ہوم رول لیگ کے مقامی رکن تھے۔ بمبئی کے گورنر لارڈ سیڈنہم نے اہلِ ہند کے خلاف کچھ حقارت آمیز الفاظ کہے تو یہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرجے اور اپنی تقریر میں اس کا نام لے کر کہا کہ

> یہی ہے وہ رجعت پسند جس نے ایک عرصہ تک ہندوستان کے خزانے سے بیش بہا تنخواہیں وصول کیں اور اب یہ ایسی سازشوں کی راہ نمائی کر رہا ہے جو کسی شریف انسان کے لئے باعثِ فخر نہیں ہو سکتیں۔

اس کے بعد وہیں کے ایک اور گورنر ——— لارڈ ولنگڈن کی باری آئی جس نے مسلم لیگ کے اجلاس کو ناکام بنانے کی نہایت مکروہ کوشش کی تھی۔ جناحؒ نے اس کی الوداعی تقریب میں اس کا وہ حشر کیا جس کا نمونہ ثبوت بمبئی کا "جناح میموریل ہال" اب تک ایستادہ ہے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت، ہندوستان کی واحد فیڈریشن بنانے کی اسکیم کی، مسلم لیگ نے کس شدت سے مخالفت کی تھی۔ انگریز چاہتا تھا کہ وہ اسکیم پروان چڑھ جائے۔ قائدِ اعظمؒ کو اس سے متفق کرنے کے لئے (بلکہ یوں کہیئے کہ خریدنے کے لئے) برطانیہ کے وزیرِ اعظم لارڈ رمزے میکڈانلڈ نے انہیں ذاتی ملاقات کے لئے بلایا اور کہا کہ "اگر تنہا ایک صوبے کا گورنر بن سکتا ہے تو کوئی اور بھی بن سکتا ہے۔ اگر تنہا لارڈ کا خطاب حاصل کر سکتا ہے تو کوئی اور بھی کر سکتا ہے"۔

اس نے سمجھا کہ یہ بہت بڑی قیمت ہے جس کے عوض جناحؒ کو آسانی سے خریدا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ جناحؒ نے کیا کہا؟ انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموشی سے وزیرِ اعظم کے کمرے سے باہر نکلنے لگے۔ اس پر وہ بڑا متعجب ہوا اور قائدِ اعظمؒ کو الوداعی الفاظ کہنے کے ساتھ یہ پوچھ ہی لیا کہ آپ کا ایسا ردِ عمل کیوں ہوا؟ ——— قائدِ اعظمؒ نے اس کے جواب میں انتہائی متانت سے کہا کہ

اب میں آپ سے کبھی نہیں ملوں گا۔ آپ مجھے بکاؤ مال سمجھتے ہیں!

اس کے ساتھ ہی آپ یہ بھی سن لیجئے کہ اسی لارڈ ولنگڈن کے ساتھ کیا ہوا تھا جس کے متعلق خان صاحب نے

انگریز اور جناحؒ

جناحؒ اور لنلتھگو

کہا ہے کہ اس نے قائدِ اعظمؒ کو وہ اسکیم بھجوائی تھی۔ ہوا یوں کہ اس نے (بہ حیثیت وائسرائے) وار کونسل مقرر کی اور اس میں مسلم لیگی وزراء، مولوی فضل الحق اور سر سکندر حیات خان کو بھی شامل کر لیا۔ مسلم لیگ نے وار کونسل کو بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا اور قائدِ اعظمؒ نے ان وزراء سے کہا کہ وہ اس سے مستعفی ہو جائیں۔ جب وائسرائے کو اس کا علم ہوا تو اس نے قائدِ اعظمؒ کو ملاقات کے لئے بلا بھیجا۔ ملاقات کے لئے گیارہ بجے صبح کا وقت مقرر تھا لیکن قائدِ اعظمؒ ٹیلیفون پر بار بار یاددہانی کے باوجود سوا گیارہ بجے سے پہلے وائسریگل لاج میں نہ پہنچے۔ وہاں پہنچ کر بغیر کسی معذرت کے وائسرائے سے ملاقات کا مقصد پوچھا۔ اس نے کہا کہ "آپ کو میرے بیان سے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں"۔ آپ کو معلوم ہے کہ قائدِ اعظمؒ نے اس کے جواب میں کیا کہا؟ آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور وائسرائے سے یہ کہتے ہوئے کہ۔ "مجھے آپ کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں"۔ ——— کمرے سے باہر نکل آئے۔

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ممتاز ہندو لیڈر، مسٹر کانجی دوارکاداس نے اپنی کتاب (INDIA'S FIGHT FOR FREEDOM) میں لکھا ہے:۔

یہ دیکھ کر دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ اٹھتی ہے کہ ہندوستان میں مسٹر جناح کی قامت اور دیانت کا کم از کم ایک لیڈر تو ایسا تھا جس میں اس قدر صداقت اور بے باکی تھی کہ اس نے انگریز وائسرائے کے منہ پر کہہ دیا کہ وہ اسے کیا سمجھتا ہے، جبکہ باقی ہندوستانی لیڈر، جن میں کانگریس ہائی کمان بھی شامل ہے، اس وائسرائے کو "بہترین انگلش جنٹلمین" اور "بہترین عیسائی جنٹلمین" جیسے خطابات سے نواز کر اس کی چاپلوسی کر رہے تھے۔ (صفحہ ۳۵۲)

اس سے بہت پہلے، جریدۂ اسٹیٹسمین نے اپنی اشاعت ۲۱ جولائی ۱۹۴۲ء کے اداریہ میں لکھا تھا:۔

یہی ایک لیڈر ہے جس نے ہمیشہ صداقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔

اور مسز سروجنی نیڈو نے (قائدِ اعظمؒ کی زندگی میں) ان کے متعلق کہا تھا:۔

میں بڑی مدت سے جناحؒ کو جانتی ہوں۔ ان کے متعلق خواہ کوئی رائے بھی قائم کی جائے لیکن میں یہ پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ انہیں کسی قیمت پر بھی خریدا نہیں جا سکتا۔

خان ولی خان کا یہ الزام (کہ قائدِ اعظمؒ انگریز کے اشارۂ ابرو کی طرف دیکھا کرتے تھے) کوئی نیا نہیں۔ ایک مرتبہ مسٹر گاندھی نے بھی ان کے خلاف ایسا ہی الزام لگایا تھا جب کہا تھا کہ

مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے جناح صاحب کی امیدیں دولت برطانیہ سے وابستہ ہیں۔ کوئی چیز جو کانگریس کرے اور دے وہ انہیں مطمئن نہیں کر سکتی۔ (ہریجن ۲۴ نومبر ۱۹۳۹ء)

قائدِ اعظمؒ نے کس شان سے جواب دیا کہ

یہ قطعی غیر اور مسلمانانِ ہند کی توہین ہے جس کا مسٹر گاندھی جیسے مرتبہ کی شخصیت کو مرتکب نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ میں مسٹر گاندھی کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند اپنی اور صرف اپنی طاقت پر بھروسہ

کئے ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لئے کانگریس اور برطانیہ دونوں کے خلاف آخری خندق تک لڑنے کا عزم کر رکھا ہے اور کسی دوسرے پر تکیہ نہیں کرنا چاہتے۔

(اسٹیٹسمین۔ کلکتہ۔ مورخہ ۹ نومبر ۱۹۳۹ء)

خان صاحب فرماتے ہیں کہ یہ "سازشی اسکیم" ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو قائداعظمؒ کے پاس بھیجی گئی تھی۔ اسی ۱۹۴۰ء کے شروع میں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ہندو اور انگریز، ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق مسلمانوں کے علی الرغم کوئی سکیم تیار کر رہے ہیں۔ اس پر قائداعظمؒ نے راجکوٹ سے ایک بیان جاری کیا جس میں پُر جلال انداز میں کہا کہ

میں انتباہ کئے دیتا ہوں ۔۔۔۔ اور مجھے اُمید ہے کہ وائسرائے اور حکومتِ برطانیہ پورے طور پر اس حقیقت کو سمجھ لیں گے کہ ماضی کی صورتِ حال کا اعادہ کیا گیا یا ان ضمانتوں کو پورا نہ کیا گیا جو دی جا چکی ہیں یا ان کا احترام ملحوظ نہ رکھا گیا تو ہندوستان میں نہایت خطرناک صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔ مسلم ہندوستان ان تمام ذرائع سے جو اس کے اختیار میں ہیں ایسی صورتِ حال کا مقابلہ کرے گا اور کسی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا۔

۲۵ فروری ۱۹۴۰ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا۔ قائداعظمؒ نے سیاسی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ولولہ انگیز تقریر کی جس میں فرمایا:۔

لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ مسلم لیگ کا مطمعِ نظر کیا ہے؟ اگر آپ کو اب تک معلوم نہیں ہوا تو غالباً آئندہ بھی معلوم نہیں ہو سکے گا۔ بہرحال سُن لیجئے، معاملہ بالکل صاف ہے۔ برطانیہ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ مسٹر گاندھی اور کانگریس ہندوستان اور مسلمانوں، دونوں پر حکومت کرنے کے خواہاں ہیں۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ ہم برطانیہ اور گاندھی میں سے کسی کو بھی مسلمانوں پر حکومت نہیں کرنے دیں گے۔ ہم آزادی چاہتے ہیں۔

اس سے بھی اہم اور مستند شہادت خود انگریز کے گھر کی ہے۔ (RUSHBROOK WILLIAMS) اپنی کتاب (THE STATE OF PAKISTAN) میں لکھتا ہے:۔

میرے بعض ہندوستانی دوست باصرار کہتے ہیں کہ پاکستان کی تخلیق انگریزوں کی انتہائی میکیاولی سیاست کی زندہ مثال ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "جب تم انگریزوں نے دیکھا کہ ہندوستان میں تمہاری حالت پتلی ہو رہی ہے تو تم نے، اپنی روایتی پالیسی ۔۔۔۔ انہیں آپس میں لڑاؤ اور حکومت کرو ۔۔۔۔ کے مطابق کانگریس کے مدِ مقابل مسلم لیگ کی پیٹھ ٹھونکی اور جناح کو اپنا آلۂ کار بنا کر، ملک کو تقسیم کر کے، ہمارے مستقبل کو مشتبہ بنا دینے کی مہم شروع کر دی"۔

رشبرک کہتا ہے کہ میں اس الزام کی تردید میں، صرف دو دلائل پیش کروں گا۔ جو شخص جناح سے ذرا بھی واقف ہے وہ مجھ سے اس امر میں اتفاق کرے گا کہ وہ (مسٹر جناح) اپنی پوری زندگی میں کسی کا آلۂ کار نہیں بنا ۔۔۔۔ چہ جائیکہ وہ انگریزوں کا آلۂ کار بنتا! اور دوسرے

یہ کہ اس تمام دوران میں، انگریزوں نے — دہلی اور لندن دونوں جگہ جس مضطربانہ انداز سے تقسیمِ ہند کی سکیم کو ناکام بنانے کی کوششیں کیں، وہ خود اس امر کی شہادت ہیں کہ انگریز کبھی تخلیقِ پاکستان کے حق میں نہیں ہو سکتا تھا۔ (صفحہ ۱۵)

لارڈ ماؤنٹ بیٹن

انگریز کی یہ کوششیں کس طرح — آخری وقت تک جاری رہیں، اس کا اندازہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اس اعتراف سے لگا لیجئے جو اس نے ۱۹۷۵ء کے اواخر میں، بی۔ بی۔ سی (لنڈن) سے براڈ کاسٹ کیا تھا۔ آن سے سوال کیا گیا تھا کہ "جب آپ ہندوستان گئے ہیں تو کیا اُس وقت اس ملک کو متحد رکھنے کا کوئی امکان تھا؟" اس کے جواب میں اس نے کہا تھا :-

میں ہندوستان گیا ہی اس مقصد کے لئے تھا کہ اسے کسی طرح متحد رکھ سکوں۔ ہم صدیوں کے بعد اس ملک کو چھوڑ رہے تھے تو چاہتے تھے کہ اسے ایک متحد ملک کی صورت میں چھوڑ جائیں۔ اگر ایسا ہو سکتا تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہوتا۔ اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ایک الم انگیز حادثہ تھا جس سے ہندوستان کی قوت پارہ پارہ ہو جاتی تھی۔ لہٰذا، میں نے اس مقصد کے لئے انتہائی کوشش کی۔ لیکن اس کی راہ میں ایک ایسا شخص حائل تھا جو پہاڑ کی طرح رکاوٹ بنے کھڑا تھا۔ اور وہ تھا، محمد علی جناحؒ، صدرِ مسلم لیگ، جو شروع ہی سے یہ کہتا چلا گیا اور اس کے ارادے کو بدلنے کے لئے میری ہر کوشش ناکام رہ گئی۔ مجھے بالآخر اس کے سامنے جھکنا پڑا!۔ (طلوعِ اسلام - فروری ۱۹۷۶ء)

اس سے بھی آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس الزام کی حقیقت کیا ہے کہ پاکستان انگریز کی سازش کا نتیجہ تھا جس کے لئے اس نے جناحؒ کو آلۂ کار بنایا تھا!

— — — (۰) — — —

انگریزوں کا نکالنا

اب آپ خان عبدالولی خان صاحب کے ترکش کے آخری تیر کو لیجئے جس کی رُو سے وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے انگریز کو ہندوستان سے نکالا تھا اور یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ بالفاظِ دیگر اس سے وہ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ وہ (اور اُن کے ہم نوا حضرات) تو انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے تھے، اور قائدِ اعظمؒ (اور مسلم لیگ سے متعلق حضرات) "ٹوڈی بچے" تھے جو انگریزوں کے زیرِ حکومت غلامی کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ سمجھنے کی ہے کہ (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں، مسلمانوں کی ایک آزاد مملکت کا تصور پیش کیا تھا اور اسی تصور نے پھر آگے چل کر مطالبۂ پاکستان کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایک عام سمجھ بوجھ کا انسان بھی اس سے اتفاق کرے گا کہ انگریزوں کی ہندوستان میں موجودگی میں، مسلمانوں کی آزاد حکومت کا امکان ہی نہیں تھا۔ اس قسم کی آزاد حکومت تو لامحالہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہی وجود میں آسکتی تھی۔ ۱۹۳۰ء میں یہ تو کہا جا سکتا تھا کہ ہم اس آخری منزل تک بتدریج پہنچ سکیں گے لیکن مسلمانوں

کی آزاد حکومت تو بہرحال انگریز اور ہندو دونوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد ہی قائم ہو سکتی تھی!

اب اس مسئلہ کے دوسرے گوشے کی طرف آیئے۔ ہندوؤں کا مقصد یہ تھا کہ انگریز وہاں سے چلا جائے اور ملک منقسم رہے۔ نیشنلسٹ مسلمان بھی ان کے ہم نوا تھے۔ ایسی صورت میں وہاں کے مسلمانوں کی حالت کیا ہوتی، اس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے ۱۹۲۷ء میں، وضاحت کر دی تھی۔ حکیم محمد حسن قرشی (مرحوم) نے حضرت علامہؒ سے اپنی ایک ملاقات کا حال لکھا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ وسط دسمبر ۱۹۲۷ء کی ایک شام، وہ اور حکیم جلال الدین (مرحوم) حضرت علامہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس زمانے میں ہندوستان میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ میں نے علامہؒ صاحب سے کہا:-

یہ ظاہر ہے کہ اسلام اور غلامی میں نسبتِ تضاد ہے۔ اسی لئے قرآنِ حکیم میں محکوم مسلمانوں کے لئے کوئی ضابطۂ حیات تجویز نہیں کیا گیا۔ بلکہ غلامی کو تعزیر و عقوبت قرار دیا گیا ہے۔ اس حالت میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ موجودہ جہادِ آزادی میں مقدمۃ الجیش کی حیثیت سے معرکہ آرا رہوں۔

اس کے جواب میں:-

حضرت علامہؒ نے فرمایا کہ مجھے اس سے اتفاق ہے کہ مسلمانوں کو جنگِ آزادی میں پیش پیش ہونا چاہیئے مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا موجودہ تحریک کے نتیجے میں مسلمان آزاد ہو سکیں گے؟ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان انگریز کی جگہ ہندو کے غلام ہو جائیں گے۔ اس سے کیا فائدہ مرتب ہوگا۔

(اوراقِ گم گشتہ۔ از رحیم بخش شاہین۔ صفحہ ۱)

یہ مختصر سا جواب ہندو کی اس سازش کو بے نقاب کرنے کے لئے دیا گیا تھا جس میں وہ آزادی کے دام ہمرنگِ زمیں میں مسلمانوں کو پھنسانا چاہتا تھا۔ ہندو کی سازش یہ تھی کہ انگریز ہندوستان سے نکل جائے تو وہاں مغربی انداز کا جمہوری نظام قائم کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام میں حکومت، اکثریت کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ ہندوستان کی آبادی میں ہندو اکثریت میں تھا اور مسلمان اقلیت میں۔ اور ہندو کی یہ اکثریت غیر متبدل (INCONVERTIBLE) تھی۔ یعنی ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ ہندو کبھی اقلیت میں ہو جائے اور مسلمان اکثریت میں۔ لہٰذا، اس جمہوری حکومت میں مسلمان کو ابدی طور پر ہندو کا محکوم رہنا تھا۔ (جیسا کہ اس وقت وہاں ہو رہا ہے) مسلمان نیشنلسٹ، اس باب میں ہندو کے ہم نوا تھے۔ اس حقیقت کی روشنی میں آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ ہندو کی سکیم کی رُو سے انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دینے کا "جہادِ عظیم" مسلمانوں کے حق میں کیا معنی رکھتا تھا؟ اور یہ ہے نیشنلسٹ مسلمانوں کا وہ کارنامہ جس کا احسان وہ قدم قدم پر جتاتے اور اہلِ پاکستان سے اس کا صلہ مانگتے ہیں! یہ تو ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہاں قائدِ اعظمؒ اور جناحؒ پیدا ہو گئے۔ ورنہ نیشنلسٹ مسلمانوں نے تو مسلمان قوم کو ابدی طور پر ہندو کا غلام بنا کر رکھ دینا تھا!

اس کے بعد جب علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں پاکستان کا تصور پیش کیا تو یہ بھی واضح کر دیا کہ اسلام

کے نقطۂ نگاہ سے غلامی اور آزادی کا مفہوم کیا ہے؟ غیر مسلموں (بلکہ یوں کہیئے کہ سیکولرزم کے حامیوں) کے نزدیک، اگر کسی ملک پر کسی دوسری قوم کی حکومت ہے تو یہ غلامی ہے۔ اگر اس پر خود ان کی اپنی حکومت ہے تو اسے آزادی کہا جائے گا۔ علامہ اقبالؒ نے بتایا کہ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے غلامی اور آزادی کا مفہوم اس سے مختلف ہے۔ اس کے نزدیک، غلامی اور آزادی کا تعین اس سے نہیں ہوتا کہ اس ملک پر اپنی قوم کی حکومت ہے یا کسی دوسری قوم کی حکومت ــــ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے غلامی اور آزادی کا معیار یہ ہے کہ اگر اس ملک میں خدا کی کتاب کی حکمرانی ہے تو مسلمانوں کو آزادی حاصل ہے۔ اگر حکومت انسانوں کی ہے (خواہ وہ اپنی قوم کے ہوں اور خواہ کسی دوسری قوم کے) تو وہ غلامی ہے۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں اصل کش مکش کی بنا ہی یہ تھی۔ اور یہ کش مکش ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہی نہیں تھی۔ اس میں ہندو اور نیشنلسٹ مسلمان ایک طرف تھے اور علامہ اقبالؒ۔ قائدِ اعظمؒ اور ان کے ہم نوا اُن کے مدِ مقابل، دوسری طرف ــــ اور حیرت یہ ہے کہ ان نیشنلسٹ مسلمانوں میں حضرات علماء کرام بھی شامل تھے۔ علامہ اقبالؒ کی زندگی کے آخری ایام میں، دیوبند کے شیخ الحدیث، مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ ان کا جو معرکہ ہوا تھا، اس میں بنا و نزاع یہی سوال تھا۔ مولانا مدنیؒ نے یہ کہا تھا کہ آزادی حاصل کرنا مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے اسلئے اس مقصد کے لئے مسلمانوں کو ہندوؤں کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اس کے جواب میں حضرت علامہؒ نے جو کچھ فرمایا وہ اسلامی اور غیر اسلامی تصورِ آزادی میں خطِ امتیاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا:۔

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں، بلکہ ہمارا اوّل مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں مکھنا۔ بولنا۔ روپیہ صرف کرنا۔ لاٹھیاں کھانا۔ جیل جانا۔ گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے۔ (معرکۂ دین و وطن)

ظاہر ہے کہ دین کی جو علم ایک شیخ الحدیث کی سمجھ میں نہیں آئی تھی وہ خان عبدالولی خان کی سمجھ میں کس طرح آ سکتی ہے؟

(۰)

آخر میں آیئے سر ظفر اللہ خان کے اس نوٹ کی طرف جو اس بحث کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ خان عبدالولی خان

سر ظفر اللہ کا نوٹ

نے اپنے اس انٹرویو میں (جو چٹان بابت ۲۱ دسمبر ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا) کہا تھا کہ انگریز کو روس کی طرف سے بڑا خطرہ تھا۔ پہلے اس نے کوشش کی کہ ہندو کو روس سے لڑا دے۔ لیکن وہ اس میں ناکام رہا تو اس نے سوچا کہ ہندو کو مسلمان سے بھڑا کر برصغیر کی تقسیم کی راہ ہموار کر لے۔ چنانچہ اس نے ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق ہندو لیڈروں کو مسلم قوت کے خلاف کھڑا کر دیا۔ جہاں تک تقسیم ہند کا تعلق تھا،

اس مشکل کا حل اس مذہبی طبقے نے نکالا جو انگریز ہی کا "خود کاشتہ پودا" تھا۔ جو بظاہر مسلم سوسائٹی کا ایک حصہ تھا مگر در پردہ اسلام کی قوتِ حاکمیہ اور مسلمانوں کے ملی اقتدار کا سخت مخالف تھا۔ اُسے انگریز نے اسی کام کے لئے تیار کیا تھا کہ وہ اسلام کے گھر میں نقب لگا کر مسلمانوں کی اجتماعی رسوائی کا سامان فراہم کرے۔ اس پولیٹیکل تنظیم کو انگریز کی طرف سے ہر طرح کی اعانت حاصل تھی۔ یہ اس کی پرانی نمک خوار تنظیم تھی۔ اس تنظیم کا لیڈر مسٹر ظفر اللہ خان آگے بڑھا اور اس نے گورنمنٹ برطانیہ کی ذہنی پریشانی دور کر دی۔ اس نے برِ صغیر کی تقسیم کا "قابلِ عمل" فارمولا تیار کیا اور اس کا مسوّدہ وائسرائے لارڈ لنلتھگو کے سپرد کر دیا۔ ..... مسٹر ظفر اللہ نے حکومتِ برطانیہ سے درخواست کی کہ مسلم لیگ اور اس کے قائدین کو اس بات سے آگاہ نہ کیا جائے کہ اس مسوّدہ کا خالق وہ ہے۔

اس کے بعد خان عبدالولی خان نے اپنے اس خط میں، جو انہوں نے ملتان کے ایک شہری محمد شریف صاحب کے نام لکھا تھا، (اور جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) اس اسکیم کی وضاحت ان الفاظ میں کی :-

جب وائسرائے لارڈ لنلتھگو، مسلم لیگی لیڈروں کو اپنا ہم خیال بنانے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے اپنی ایگزیکٹو کونسل کے ایک رکن، مسٹر ظفر اللہ خان کی خدمات حاصل کیں اور اُسے ہدایت کی کہ وہ برِ صغیر کی تقسیم اور قیام پاکستان کی ایک اسکیم تیار کرے۔ اس سے قبل زبانی طور پر تو ایک علیحدہ مسلم ریاست کی باتیں کی جا رہی تھیں لیکن کوئی تحریری دستاویز موجود نہ تھی۔ اس لئے وائسرائے کی ہدایت کے مطابق مسٹر ظفر اللہ خان نے ایک تجویز تیار کی، جسے قرارداد کی شکل میں منظور کر لیا گیا۔ (چٹان - یکم فروری تا ۸ فروری ۱۹۸۲ء - صـ۲۲)

خان ولی خان کا (۲۱ دسمبر کا) انٹرویو شائع ہونے کے فوری بعد، سر ظفر اللہ خان نے ان کے الزام کی تردید کی اور (۲۴ دسمبر ۱۹۸۱ء کے روزنامہ جنگ (لاہور) میں شائع شدہ اپنے بیان میں کہا کہ

میں نے تقسیم ہند کے متعلق کبھی کوئی فارمولا وائسرائے ہند، لارڈ لنلتھگو کو پیش نہیں کیا تھا۔

لیکن اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد اخبارات میں سر ظفر اللہ خان کا وہ طویل نوٹ شائع ہو گیا جو انہوں نے لارڈ لنلتھگو کو دیا تھا۔ (دیکھئے پاکستان ٹائمز مورخہ ۲۳ جنوری ۱۹۸۲ء)۔ اس پر سر ظفر اللہ خان نے ایک بیان شائع کیا جس میں تسلیم کیا کہ انہوں نے واقعی لارڈ لنلتھگو کو تقسیم ہند کی اسکیم پیش کی تھی جس کی کاپی قائدِ اعظمؒ کو بھی بھیجی گئی تھی۔ (ملاحظہ ہو پاکستان ٹائمز مورخہ ۱۳ فروری ۱۹۸۲ء)۔ یعنی پہلے

صاف مُکر گئے اور جب وہ نوٹ اخبارات میں شائع ہو گیا تو اس کا اعتراف کرنا پڑا، لیکن وہ بھی اس امر کی معذرت کئے بغیر کہ انہوں نے جو بیان پہلے دیا تھا وہ غلط تھا۔ اس اثنا میں، لندن میں پاکستانی سفارت خانہ کے منسٹر انفارمیشن قطب الدین عزیز صاحب کا ایک انٹرویو، روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۱۲ فروری ۱۹۸۲ء کے میگزین ایڈیشن میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے سرظفر اللہ خان کے نوٹ (مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء) کا ملخص پیش کیا ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ سرظفر اللہ خان نے پاکستان سکیم کو مسترد کرتے ہوئے، اپنی تجویز پیش کی تھی جسے وہ علیحدگی کی اسکیم (SEPARATION) سے تعبیر کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے نوٹ میں لکھا تھا:۔

ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان اسکیم کے مقابلہ میں جس منصوبہ کو حال میں سب سے زیادہ حمایت حاصل ہوئی ہے وہ "علیحدگی کا منصوبہ" ہے۔ پاکستان اسکیم اور علیحدگی کی اسکیم میں جو بڑا فرق ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان اسکیم کے تحت تبادلۂ آبادی اشد ضروری ہے اور علیحدگی کی اسکیم میں ایسا کوئی ناممکن اور غیر عملی منصوبہ شامل نہیں۔ مختصراً علیحدگی کی اسکیم کا تصوّر یہ ہے کہ برّصغیر کے شمال مشرق میں ایک وفاق ہو جس میں بنگال اور آسام کے صوبے شامل ہوں اور شمال مغرب میں ایک اور وفاق ہو جس میں پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان اور سرحد کے قبائلی علاقے شامل ہوں۔ ہندوستان کے باقی علاقے اسی طرح یا تو ایک واحد یا متعدد وفاق بنا لیں۔ شمال مشرق اور شمال مغرب کے وفاق تاجدارِ برطانیہ سے منسلک ہوں گے۔ اسی طرح بقایا ہندوستان میں جو وفاق یا متعدد وفاق قائم ہوں وہ بھی تاجدارِ برطانیہ سے منسلک ہوں گے۔

قبل اس کے کہ ہم سرظفر اللہ خان کی اسکیم اور قرارداد پاکستان کا مقابلہ کریں، ایک اور واقعہ سامنے لانا بھی ضروری ہے۔ ۹ فروری ۱۹۸۲ء کے روزنامہ جنگ (لاہور) میں وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو کی ڈائری کا ایک ورق چھپا ہے جس میں قائدِ اعظمؒ کی وائسرائے کے ساتھ اس طویل ملاقات کا تذکرہ ہے جو ۴ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہوئی تھی۔ (اس تاریخ یعنی ۴ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ذہن میں رکھئے کیونکہ سرظفر اللہ خان کا نوٹ ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو بھیجا گیا تھا)۔ وائسرائے نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے:۔

میں نے مسٹر جناحؒ سے معلوم کیا کہ آپ اپنے حالیہ بیان کے بارے میں بتائیے جس میں آپ نے کہا ہے کہ اب آپ ہندوستان کے لئے جمہوری حکومت پر یقین نہیں رکھتے۔ اگر جمہوری حکومت اس ملک کے لئے نامناسب ہے تو اسے کس طرح خود مختاری اور آزادی حاصل ہو سکتی ہے...؟ آپ کی اس پالیسی سے انڈیا میں مستقل فرقہ وارانہ جنگ ہوتی رہے گی۔ مسٹر جناح نے جواب دیا کہ اس تعطل سے بچنے کے لئے واحد راہ تقسیم ہند ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ اگر تفصیل جائزہ لیا جائے

ح۔۔۔ سرظفر اللہ خان نے کہا ہے کہ جس پاکستانی اسکیم کی انہوں نے مخالفت کی تھی اس سے مراد چوہدری رحمت علی مرحوم کی اسکیم تھی۔

تو تقسیم اس کا عملی حل نہیں۔ مسٹر جناحؒ نے برجستہ جواب دیا۔" برما کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ لوگ بہت خوش ہیں"۔

اس کے بعد قائدِ اعظمؒ ۶ر فروری ۱۹۴۰ء کو پھر لارڈ لنلتھگو سے ملے اور اسے بتایا کہ مسلم لیگ کا جو اجلاس مارچ ۱۹۴۰ء کو ہو رہا ہے، اس میں تقسیمِ ہند کا مطالبہ پیش کیا جائے گا۔ (چوہدری خلیق الزمان کی کتاب "پاتھ وے ٹو پاکستان"۔ صفحہ ۲۳۴۔ بحوالہ پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۲۶ فروری ۱۹۸۲ء)۔

ان حقائق سے دو باتیں واضح ہیں۔ ایک تو یہ کہ قائدِ اعظمؒ نے لارڈ لنلتھگو پر ستمبر ۱۹۳۹ء اور فروری ۱۹۴۰ء میں واضح کر دیا تھا کہ مسلم لیگ کا مطالبہ تقسیمِ ہند کا ہے۔ لہٰذا، یہ کہنا صحیح نہیں کہ ان کے ذہن میں تقسیمِ ہند کا سوال مارچ ۱۹۴۰ء میں سر ظفر اللہ خان کے نوٹ سے پیدا ہوا۔ اور دوسرے یہ کہ تقسیم سے اُن کی مراد مسلمانوں کے لئے آزاد مملکت کا قیام تھا۔

سر ظفر اللہ خان نے اپنی وضاحت (شائع شدہ ۱۳ر فروری ۱۹۸۲ء) میں کہا ہے کہ

> قراردادِ پاکستان، بالکل (EXACTLY) میری علیحدگی کی اسکیم کے مطابق تھی۔

اس سے وہی مغالطہ دینے کی کوشش کی گئی ہے جس کا تاثر ولی خان صاحب نے پیدا کرنا چاہا تھا۔ ظفر اللہ خان صاحب کی علیحدگی کی اسکیم اور قراردادِ پاکستان میں ایک بنیادی فرق ہے۔ علیحدگی کی اسکیم میں، مسلمانوں کے دونوں وفاق تاجدارِ برطانیہ سے وابستہ رہتے ہیں اور قراردادِ پاکستان میں مسلمانوں کی آزاد مملکتوں کا مطالبہ ہے۔ ایک آزاد مملکت اور تاجِ برطانیہ سے وابستہ وفاق میں جو بنیادی فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ قائدِ اعظمؒ کسی صورت میں بھی ایسے پاکستان کو قبول نہیں کر سکتے تھے جو کا ملتہً آزاد نہ ہو۔ (اور تاجِ برطانیہ سے وابستہ رہے)۔ یہی تو وہ فرق تھا جس کی وجہ سے حکومتِ برطانیہ آخری وقت تک پاکستان کی مخالفت کرتی رہی۔ اور (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) قائدِ اعظم برابر اعلان کرتے رہے کہ

> برطانیہ، ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ مسٹر گاندھی اور کانگریس ہندوستان اور مسلمانوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم ــــ نہ انگریز کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دیں گے، نہ مسٹر گاندھی کو۔ ہم آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ (آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ ۲۵ فروری ۱۹۴۰ء سے خطاب)
> (تقاریر قائدِ اعظمؒ۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۵۳)

۱ـ قائدِ اعظمؒ نے وار کونسل کے سلسلہ میں جو کچھ لارڈ لنلتھگو کے ساتھ کیا تھا، اسے ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ اس مقام پر ایک اور چشمک ملاحظہ فرمایئے۔" وسط ستمبر ۱۹۳۹ء میں وائسرائے نے مسٹر جناحؒ سے کہا کہ انہوں نے مسٹر گاندھی کو بلایا ہے، آپ بھی تشریف لایئے۔ مسٹر جناحؒ نے جواب دیا کہ میں ان دنوں بہت مشغول ہوں۔ یکم اکتوبر سے پہلے نہیں آ سکتا۔ اس سخت جواب سے سر سکندر حیات اور سر ظفر اللہ خان بہت ناخوش ہوئے"۔ (جنگ لاہور۔ ۹ر فروری ۱۹۸۲ء)

ضمناً۔ سر ظفر اللہ خان نے جو اسکیم پیش کی تھی وہ بھی کوئی انوکھی اسکیم نہیں تھی۔ مسلم لیگ کے تقسیم ہند کے اصولی فیصلے کے بعد، اس کی تفصیلات کے متعلق ۱۹۳۹ء میں ملک میں متعدد اسکیمیں گردش کر رہی تھیں۔ (مثلاً) (۱) ڈاکٹر سید عبداللطیف حیدرآبادی (مرحوم) کی اسکیم۔ (۲) "ایک پنجابی" (میاں کفایت علی) کی اسکیم۔ (۳) چوہدری رحمت علی (مرحوم) کی اسکیم۔ (۴) علیگڑھ اسکیم (جسے وہاں کے دو پروفیسرز ڈاکٹر سید ظفر الحسن اور ڈاکٹر افضال حسین قادری نے مرتب کیا تھا)۔ اور (۵) سر سکندر حیات خان (مرحوم) کی اسکیم۔ ان تمام اسکیموں کو مسلم لیگ کی کانسٹی ٹیوشن سب کمیٹی نے مسترد کر دیا تھا کیونکہ وہ لیگ کے مطمح نگاہ ——— ہندوستان سے کاملیۃً علیحدگی اور مکمل آزادی ——— پر پوری نہیں اترتی تھیں۔ اسی انداز کی سر ظفر اللہ خان کی اسکیم بھی تھی جسے (انہوں نے قائداعظمؒ کے پاس بھیجا بھی ہوگا تو) لیگ نے مسترد کر کے اپنی اسکیم منظور کی تھی۔

———(۰)———

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہے کہ

(۱) مسلمانانِ ہند کے لئے ایک الگ، آزاد مملکت کا تصوّر، علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں دیا تھا تاکہ اس میں قرآنی حکومت کا قیام عمل میں لایا جا سکے۔

(۲) ان کے اس تصوّر کا چرچا اسی زمانہ میں عام ہو گیا تھا، اور لندن کے نامور سیاسی مشاہیر تک کے کانوں میں یہ آواز پہنچ چکی تھی۔

(۳) علامہ اقبالؒ نے اسی زمانے سے قائداعظمؒ کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوششیں شروع کر دی تھیں اور وہ ان سے بالآخر متفق ہو گئے تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۶ء میں جو خطوط قائداعظمؒ کو لکھے تھے ان میں تقسیم ہند اور مسلمانوں کے لئے ایک آزاد اسلامی مملکت کی تجویز نمایاں تھی۔

(۴) قائداعظمؒ نے بھی اس مطالبہ کو پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ سندھ پراونشل مسلم لیگ کانفرنس (منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۸ء) میں اس امر کی ایک قرارداد بھی منظور کر لی گئی تھی۔

(۵) انہوں نے ۱۹۳۹ء میں لارڈ لنلتھگو، (وائسرائے ہند) سے بھی واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ہندوستان کے مسائل کا حل تقسیم ملک اور مسلمانوں کی آزاد مملکت کے سوا کچھ نہیں۔

(۶) اسی کے مطابق ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قراردادِ لاہور پاس ہوئی تھی۔

(۷) سر ظفر اللہ خان نے تقسیم کی جو تجویز وائسرائے کو پیش کی تھی وہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ لیکن اس میں اور قراردادِ لاہور میں بنیادی فرق تھا۔

(۸) لہٰذا، یہ کہنا خلافِ حقیقت ہے کہ قائداعظمؒ نے سر ظفر اللہ خان کے نوٹ سے یہ خیال اخذ کر کے اس کے مطابق قراردادِ لاہور منظور کرا دی تھی۔

اور سب سے بڑی اور منفرد بات یہ کہ تصوّرِ پاکستان نہ کسی ظفر اللہ خان کی اپج تھی، نہ کسی لنلتھگو کی سازش ——— حتیٰ کہ نہ اقبالؒ کے ذہن کی تخلیق تھا، نہ قائداعظمؒ کے تخیل کا رہینِ منت۔ یہ ہمارے

دین کا تقاضا تھا جسے ہمارے زمانے میں علامہ اقبالؒ نے سمجھا اور جس کے مطابق قائدِ اعظمؒ نے ایک عظیم مملکت حاصل کر کے ہمارے حوالے کر دی کہ ہم بے کار بیٹھے یہ گتھیاں سلجھاتے اور سر دھنتے پھیلاتے رہیں کہ تصورِ پاکستان کا خالق کون تھا؛ جس مقصد کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا، اگر اس کے مطابق یہاں حکومت قائم ہو جاتی۔۔۔ یعنی یہ "پہلے اور حقیقی پاکستان" کا نقشِ ثانی بن جاتا ـــــ تو جن لوگوں نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی انہیں اس قسم کے اعتراضات کا موقعہ ہی نہ ملتا۔ اس مملکت کا وجود اس سوال کا زندہ جواب ہوتا کہ اس کے قیام کا جذبۂ محرکہ کیا تھا؟.....

(جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے) ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہمارے ہاں نہ تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ مرتب ہوئی ہے، نہ قائدِ اعظمؒ کے قابلِ اعتماد سوانح حیات۔ (اور یوں نظر آتا ہے کہ ایسا دانستہ کیا گیا ہے کیونکہ اس قسم کی حقیقی اور مستند دستاویزات کی موجودگی میں نہ کسی کے لئے کسی قسم کی من مانی کرنے کی گنجائش ہوتی، نہ اپنی ہر اسکیم کو اسلامی کہہ کر پیش کرنے کی جرأت۔ ایسی تاریخ مرتب نہ ہوئی اور) وہ لوگ آہستہ آہستہ اٹھتے جا رہے ہیں جو اس معرکہ میں خود شریک تھے۔ اس کے بعد کوئی یہ بتانے والا بھی نہیں رہے گا کہ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا؛ اس طرح حقیقت خرافات میں کھو جائے گی اور اس کی جگہ افسانے لے لیں گے۔ یہی کچھ پہلے حقیقی "پاکستان" کے ساتھ ہوا تھا، یہی کچھ اس خطۂ زمین کے ساتھ ہوگا جسے "پاکستان" بنانے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔

بایں ہمہ، خدا کی کتاب، یہ بتانے کے لئے زندہ اور پائندہ رہے گی کہ حقیقی پاکستان کا قیام کس طرح دین کا تقاضا ہے۔ اس کتابِ عظیم کے مطابق "پاکستان" بہرحال قائم ہونا ہے ـــ یہاں نہ سہی، کہیں اور سہی۔ (اقبالؒ کے الفاظ میں)، ؎

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است — سازِ قرآں را نوا ہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر — آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
ذکرِ حق از امتاں آمد غنی ! — از زمان و از مکاں آمد غنی!
ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جدا است — احتیاجِ روم و شام او را کجا است
حق اگر از پیشِ ما بردارَدش — پیشِ قومے دیگرے بگذاردش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن — ہر زماں جانم بلرزد در بدن
ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند!

(جاوید نامہ۔ صفحہ ۹۱)

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ع (۴۷/۳۸)

اگر تم روگردانی کرو گے تو اللہ تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئیگا۔ اور وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

اقبالؒ ہی نے دوسرے مقام پر اس الم انگیز نوحہ کو ایک مصرعہ میں سمو کر رکھ دیا ہے

داستان کا کیا پوچھتے ہو، وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ

خوابم ز یاد رفتہ و تعبیرم آرزو ست

میں نے ایک خواب دیکھا تھا جو بھول چکا ہے۔ اور میں اس بھولے ہوئے خواب کی تعبیر لوگوں سے پوچھتا پھرتا ہوں! آج جو اس قسم کے سوالات پوچھے جا رہے ہیں کہ حصولِ پاکستان سے مقصد کیا تھا؟..... اسلامی نظام ہوتا کس قسم کا ہے!..... اسلامی مملکت کی امتیازی خصوصیت کیا ہے..... تو یہ سب ایک بھلائے ہوئے خواب کی تعبیریں دریافت کرنے کی سعی لاحاصل ہے۔

ان سوالات کا جواب قرآن سے مل سکتا تھا لیکن قرآن سے اس قوم کو اس طرح ڈر لگتا ہے جس طرح دربارِ فرعون کے مذہبی پیشوا عصائے کلیمی سے لرزاں و ترساں تھے کہ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ... (۷/۱۱۷) "وہ ان کی افترا پردازیوں کو نگل جائے گا"۔

لیکن یہ ساحرین، اپنی شعبدہ بازیوں کو کب تک بچائے رکھیں گے۔ انہوں نے ایک دن تھمنا ہے۔

رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم

صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

اُس وقت نہ کسی فرعون کی آمریت باقی رہے گی، نہ کسی ہامان کی عبودیت۔ نہ کسی سامری کی فسوں سازیاں وجہ ابلہ فریبی ہوں گی، نہ کسی قارون کی استحصال انگیزیاں۔ اس وقت حکومت صرف خدا کی کتاب کی ہوگی۔ وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا ...... اور یوں "زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی"۔۔۔ اس وقت اندھے بھی دیکھ لیں گے کہ جس "پاکستان" کا تصور اقبال نے پیش کیا تھا وہ کس قدر حیات بخش اور انسانیت ساز ہوتا ہے۔

آ! اے میری بے چین نگاہوں کے سہارے

مدت سے تیری راہ گذر دیکھ رہا ہوں!

مطالبۂ پاکستان اور تشکیلِ پاکستان کے بعد کے عواقب کی پوری داستان قرآن کریم کی اس ایک آیت میں سمٹی ہوئی ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ .... هُمُ الْفَاسِقُونَ (۲۴/۵۵)

جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اور اس کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق کام کریں ان سے خدا نے وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں مملکت عطا کی جائے گی جس طرح اس پروگرام پر عمل کرنے والی سابقہ اقوام کو مملکت عطا کی گئی تھی۔ اس مملکت کا مقصود یہ ہوگا کہ خدا کے پسندیدہ دین کو تمکن حاصل ہو۔ ان لوگوں کا خوف امن سے بدل جائے۔ وہ اس قابل ہو جائیں کہ صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت کریں اور دنیا کی کوئی طاقت انہیں مجبور نہ کر سکے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کریں۔

جو لوگ ایسی مملکت حاصل ہو جانے کے بعد اس کے اس مقصود و منتہیٰ سے انکار کر دیں، اور قوانینِ خداوندی کے بجائے اپنے قوانین نافذ کرنے لگ جائیں، تو انہیں اس سے محروم کر دیا جائے گا۔

(۰)

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک

(جسے معلوماتِ عامہ کے لئے وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا ہے۔)

(۱) تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنے رہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

(۲) خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے ابد تک ضابطۂ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضورؐ رسالتمآب خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

(۳) قرآنِ کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابعِ تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

(۴) نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمتِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے۔ سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورؐ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی اصول صحابۂ کبارؓ کی سیرتِ مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہیئے۔

(۵) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظامِ مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظامِ زندگی کا نام ہے) ممکن نہیں ہو سکتا۔

(۶) رسول اللہؐ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امورِ مملکت آپس کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

(۷) رسول اللہؐ کے بعد دین کا وہی نظام حضورؐ کے خلفائے راشدین نے جاری رکھا۔ اس میں امورِ مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآنِ کریم نے

صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر اُمت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔

(۸) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے اُمت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور، دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن اب مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

(۹) ہمارے لئے کام کرنے کا یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو اُمت کو احکام و قوانینِ خداوندی کے مطابق چلائے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانینِ خداوندی کے تابع ہو گی۔

(۱۰) چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہو گا۔ اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہو گا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کیلئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہم گڈمڈ ہو جائیں گے۔

(۱۱) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا، اُمت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز، روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردّ و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اُسے "خدا اور رسول" کا طریقہ قرار دے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مقصد صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی، روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

(۱۳) قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

(۱۴) جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآنِ کریم کے مطابق ہو، یا جس سے حضور نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

(۱۵) ہم، رسول اللہؐ کے بعد، ہر قسم کے مدعیٔ وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

(۱۶) طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقۂ اہلِ قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)۔ نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ اُمت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز، روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں، ہم ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کرتے۔ اور بلا ردّ و بدل ان کی پابندی کرتے ہیں۔ ہم قرآنِ کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کا قیام عمل میں آ سکے۔ یہ ہے ہمارا مسلک، جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ مخالفین کا گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے۔

(۰)

سربستہ حقیقتیں بے نقاب — اسرار و رموز واشگاف

پرویز صاحب متعارف تو مفکرِ قرآن کی حیثیت سے ہیں، لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ کون کونسی ہوشربا وادیوں اور حیرت فروش منزلوں سے گذر کر اس چشمۂ نور و حیات تک پہنچے ہیں۔ ان کا بچپن، تصوف کے خواب آور گہوارہ میں گذرا۔ جب ان کے شعور نے آنکھ کھولی تو ان کے دل میں خلش پیدا ہوئی کہ معلوم کیا جائے کہ تصوف کی اصل و بنیاد کیا ہے۔ جسے مشاہدۂ حقیقت کہا جاتا ہے اس کی کنہ و ماہیت کیا ہے۔ واردات قلبی کا سرچشمہ کونسا ہے۔ مختلف ریاضتوں اور مراقبوں سے جو وجد و حال حاصل ہوتی ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ تعویذوں اور گنڈوں میں اثر کیسے پیدا ہوتا ہے۔ کرامات کس طرح سرزد ہوتی ہیں۔ یہ، اور اسی قسم کے سینکڑوں سوالات ان کے سینے میں ابھرے جن کے حل کی تلاش میں وہ برسوں صوفیائے کرام کی درگاہوں اور خانقاہوں۔ ہندو سادھوؤں کی سمادھیوں اور سنیاسیوں کے یوگ آشرموں میں سرگرداں رہے اور اس طرح جو کچھ پڑھا تھا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جو کچھ سنا تھا اس کا ذاتی مشاہدہ کر لیا۔ ان واردات و مکاشفات کا علم و تجربہ حاصل کرنے کے بعد وہ دانشِ نورانی (کتاب اللہ) کے سنگِ آستاں پر سجدہ ریز ہوئے۔

اب انہوں نے اپنی ان آستاں نوردیوں اور خانقاہ پیمائیوں کی سرگذشت اور خود تصوف کی تاریخ کو اپنے مخصوص دلآویز انداز میں، اپنی اہم تصنیف

تصوف کی حقیقت

میں منضبط کر دیا ہے۔ اس کے دو باب ہیں — اوّل، تصوف اور اسلام — دوم، تصوف اور اقبالؒ — مستور حقیقتوں کا آئینہ، اور سربستہ رموز و اسرار کا گنجینہ — کتابت، طباعت کاغذ عمدہ — جلد مزین اور مطلّا — ضخامت چار سو صفحات سے زائد قیمت -/۷۵ روپے (محصول ڈاک -/۵ ")

ملنے کا پتہ:

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

شاہکارِ رسالت

عمر فاروقؓ

تیسرا ایڈیشن

اکثر سوالات اُبھرتے ہیں کہ

- اسلام کا معاشرتی۔ تمدنی۔ عسکری۔ سیاسی۔ معاشی نظام کیا ہے؟
- کیا یہ نظام کبھی عملی شکل میں قائم ہوا تھا؟
- اگر قائم ہوا تھا تو کب؟ اور اس کا انداز کیا تھا؟

پھر اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ

- اگر یہ نظام قائم ہوا تھا تو پھر آگے کیوں نہ چلا؟
- وہ نظام (یعنی دین) موجودہ مذہب میں کس طرح تبدیل ہو گیا؟
- عجمی سازش سے کیا مراد ہے؟
- اب صحیح اسلامی نظام کے احیاء کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟

ان سوالات کا نہایت مدلل، مستند، معقول، اطمینان بخش جواب اس کتاب میں ملے گا جو مفکرِ قرآن جناب پرویز کی مدت العمر کی تحقیقاتی کاوش اور عمیق غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

نیز اس میں فقہ، حدیث، امامت، تصوف، کشف و الہام، دعوائے ماموریت اور ختمِ نبوت کے متعلق تاریخی مباحث اور حیرت انگیز انکشافات ملیں گے

اس کا سابقہ ایڈیشن ختم ہو گیا تھا۔ اب تازہ ایڈیشن اسی آب و تاب کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔

بڑے سائز کے قریب چھ سو صفحات پر مشتمل تصنیف۔ سفید کاغذ۔ جلد مضبوط مزین اور مطلا ۔۔۔ قیمت -/۷۵ روپے ۔۔۔ ڈاک پیکنگ -/۷ روپے

ملنے کے پتے (۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور